مضامین سرو

Tahqeek

6

290

مضامین نہرو

جلد اوّل

مترجمہ

آنند نرائن مُلاّ

پرنٹر و پبلشر

انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

قیمت ۶/

ایڈیشن

باہتمام کالی۔ کے مترا
انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد میں چھپا

فہرست مضامین

"مضامین نہرو" جلد اوّل



پنڈت جواہر لال نہرو

بانس کی کھپچّی

غالباً آخر ۱۹۳۶ء یا شروع ۱۹۳۷ء میں میرے دل میں پہلے پہل یہ بات آئی کہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کے انگریزی مضامین کا اُردو میں ترجمہ کروں۔ یہ خیال مجھے کیوں پیدا ہوا اس کی چار وجہیں لوگوں کے ذہن میں آئیں گی۔

(۱) پنڈت جواہر لال نہرو سے میری ذاتی عقیدت۔

(۲) وہ انسانی کمزوری جس کی وجہ سے ہم کسی بڑے آدمی سے کسی قسم کی دُور کی بھی نسبت پیدا کر لینا چاہتے ہیں تاکہ جس طرح ذرّہ سورج کی کرنوں میں چمکنے لگتا ہے اسی طرح ہم بھی اس بڑی ہستی کے عکس سے ایک حد تک جگمگا اُٹھیں۔

(۳) تجارتی نقطۂ نظر یعنی یہ سمجھ کر کہ پنڈت جواہر لال کے مضامین کا ترجمہ چھاپنے والے اور خریدار دونوں آسانی سے مل جائیں گے اور کافی کتابیں بِک جائیں گی۔

(۴) اپنی قابلیت کے بارے میں غلط فہمی اور اس کا بیجا اظہار۔

ممکن ہے کہ لوگ اپنی اپنی جگہ پر ان میں سے کسی ایک وجہ سے مطمئن ہو جائیں اور یہ وجہ شعوری یا غیر شعوری طور پر میرے ذہن میں موجود بھی ہوں

لیکن دراصل ان میں سے کوئی وجہ اس ترجمہ کی محرک نہیں۔ غالباً اس کتاب کو پڑھنے والے یہ اصرار نہ کریں گے کہ میں اصل وجہ بھی بتاؤں کیونکہ وہ میرے دل کی بات ہے اور مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں اُسے اپنے دل ہی میں محفوظ رکھوں۔

(۲)

کچھ دن تک اس خیال کو میں نے اپنے دل ہی میں رکھا۔ میری ہمت نہ پڑی کہ میں فوراً پنڈت جواہر لال سے اس کی اجازت مانگوں۔ مجھ کو یہ اندازہ کرنا تھا کہ مجھ میں اتنی قابلیت ہے بھی کہ نہیں۔ تھوڑا تھوڑا کر کے میں نے سب میں پہلے Whither India کا ترجمہ کیا۔ مجھے اس کے ترجمہ کرنے میں قریب دو مہینے کے لگ گئے کیونکہ میں گھنٹہ دو گھنٹہ سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا تھا اور ایک صفحہ کا ترجمہ کرنے میں مجھے قریب قریب ایک گھنٹہ لگ جاتا تھا۔ ترجمہ تو میں نے کر لیا لیکن اب مجھے یہ فکر تھی کہ اگر میں اسی رفتار سے ترجمہ کروں گا تو غالباً کئی سال لگ جائیں گے۔ میں نے اپنے دل کا جائزہ لیا اور یہ محسوس کیا کہ اگر کئی سال بھی لگ جائیں گے تب بھی میرا ارادہ قائم رہے گا۔ یہ جان کر میں نے ایک بار جب پنڈت جواہر لال لکھنؤ آئے اُن سے ڈرتے ڈرتے اس کا ذکر کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اِسے منظور نہ کریں گے کیونکہ ان کی خود نوشتہ سوانح عمری کا ترجمہ جامعہ والے کر چکے تھے۔ لیکن انھوں نے میری استدعا قبول کر لی اور مجھے اجازت دیدی کہ میں ان کے مضامین کا انتخاب کر کے ترجمہ کروں۔ اُنھوں نے

مجھ سے یہ ضرور کہا کہ میں اس ترجمہ کے شائع کرنے کے لیے 'جامعہ دہلی' سے خط کتابت کروں۔ میں نے جامعہ والوں کو خط لکھا اور اُس میں سب واقعات مفصل لکھ دیے۔ انھوں نے شائع کرنے کی رضامندی ظاہر کی لیکن یہ تحریر فرمایا کہ میں اپنے ترجمہ کا ایک جزو نمونہ کے طور پر ان کے پاس بھیج دوں۔ اصولی اعتبار سے جامعہ والوں کا یہ مطالبہ محض جائز ہی نہیں تھا بلکہ صحیح تھا لیکن میرے دل کو یہ بات خواہ مخواہ ناگوار ہوئی۔ اس کے علاوہ میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر یہ ترجمہ جامعہ میں شائع ہوگا تو میں خود پروف کی تصحیح نہ کر سکوں گا۔ اس وجہ سے میں نے 'انڈین پریس الٰہ آباد' کو جو میری مرتبہ کتاب "یادِ چکبست" حال ہی میں شائع کر چکے تھے لکھا۔ انھوں نے میری سب باتیں منظور کر لیں اور اس کتاب کو علی حسین کاتب لکھنؤ ہی میں لکھنے لگے۔

(۳)

کتاب لکھنا تو شروع ہو گئی لیکن میری فطری کاہلی یا ترجمہ کی مشکلوں کی وجہ سے نوبت یہاں تک آگئی کہ آئے دن نوکر باہر سے آکر اطلاع دیتا تھا "حضور! علی حسین آئے ہیں" اور میں جواب دیتا تھا "اُن سے کہو پرسوں آئیں" اور اس طرح پانچ سات پرسوں ٹلنے کے بعد علی حسین کو کچھ صفحات مل جاتے تھے۔ علی حسین نے زبان سے تو کبھی کچھ نہیں کہا لیکن غالباً وہ میرے 'پرسوں' کے معنی بخوبی سمجھنے لگے تھے اور میں بغیر ان کے کچھ کہے ان کی خاموش مسکراہٹ

دیکھ کر دل ہی دل میں نادم ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ اندازِ گفتگو کب تک چل سکتا تھا، چنانچہ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ میں کسی کو ترجمہ میں ہاتھ بٹانے کے لئے اپنا شریک کرلوں۔ میں نے سید احتشام حسین صاحب ماہلی سے جو لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو کے لکچرار ہیں درخواست کی کہ وہ مجھے کچھ مدد دیں۔ وہ بیچارے مروت کے مارے انکار نہ کر سکے اور میں نے ان کی شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اس مجموعہ میں (۱) "ٹرین میں" (۲) "اپنے دوستوں اور نکتہ چینوں سے" (۳) "تامل ناد کو خیرباد کہتے وقت" (۴) "کانگریس اور اشتراکیت" اور (۵) "پیامات۔ انتخاب کے موقع پر"۔ یہ پانچ مضامین انھیں کے ترجمہ کئے ہوئے ہیں۔ اُن کے اس اخلاص نے جو جذبات میرے دل میں پیدا کئے ہیں وہ باوجود اس اعتراف کے تشنۂ اظہار ہیں۔

(۴)

میں نے اوپر ترجمہ کی مشکلوں کا ذکر کیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ جو دشواریاں مجھے شروع شروع میں پیش آئی تھیں وہ آگے چل کر جب مجھے ترجمہ کرنے کی عادت ہو جائے گی باقی نہ رہیں گی۔ لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا اور آخر وقت تک مجھے انھیں مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ اُردو زبان پر مجھے کافی عبور نہیں۔ مجھے تو ہر جملہ پر کافی دیر تک اٹکنا پڑتا تھا اور جس طرح کوئی امتحان کا پرچہ کرتا ہے اس طرح میں نے یہ ترجمہ کیا ہے۔ قدم قدم پر مجھے اُردو کی کوتاہی داماں کا احساس ہوتا تھا اور کچھ دیر کے لئے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس خیال کا اظہار

اُردو میں ناممکن ہے لیکن کسی نہ کسی طرح ترجمہ ہو ہی جاتا تھا اور میں آگے بڑھتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ احتشام صاحب پر کیا بیتی لیکن جس رفتار سے انھوں نے ترجمہ کیا ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس منزل میں ان کا سبک یا خامہ بھی اپنی معمولی چوکڑیاں بھول گیا اور میرے قلم سے کچھ زیادہ تیز چال نہ چل سکا۔

(۵)

یہ بات قابل افسوس ضرور ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ احتشام صاحب کی سُست روی دیکھ کر مجھے ایک خاص طرح کی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ مجھے کسی قدر یہ اطمینان ہوتا تھا کہ محض میری بے بضاعتی ہی ترجمہ کی مشکلوں کی وجہ نہیں بلکہ ایک حد تک پنڈت جواہر لال کی طرز تحریر بھی اس کی ذمہ دار ہے کسی صاحبِ طرز کے مضامین کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنا آسان نہیں۔ جس کسی نے پنڈت جی کے تھوڑے سے بھی انگریزی مضامین پڑھے ہوں گے اس کے دل پر ان کی طرزِ نگارش کی تین خصوصیتیں ضرور نقش ہو گئی ہوں گی۔ سب میں پہلی خصوصیت ان کی ذہنی رفعت ہے۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے سوال کو وہ ایک حکیمانہ انداز میں حل کرتے ہیں اور اُسے جدوجہد انسانی کا پسِ منظر دے کر پیش کرتے ہیں۔ چونکہ انھیں انگریزی زبان پر قدرت حاصل ہے اس لئے وہ زندگی اور سماج کے تمام مسائل کی پیچیدگیاں اور گہرائیاں اس خوبی اور آسانی سے بیان کرتے چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کو تو اس کا حس نہیں ہوتا لیکن ترجمہ کرنے والے کا دل ہی جانتا ہے۔ اور چونکہ انھیں

اپنے مخاطب کے شکوک رفع کرنے ہوتے ہیں لہذا وہ قدم قدم پر دل و دماغ کا جائزہ لیتے ہوئے بڑھتے ہیں۔ وہ خیال کی ان بلندیوں پر پہونچ جاتے ہیں جن کی ترجمانی کرتے وقت معمولی انسانوں کی زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔ ان کی طرز نگارش کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر موضوعِ زیر بحث میں اپنے ذاتی تاثرات اس انداز سے شامل کر دیتے ہیں کہ ان کا ہر مضمون بجائے ایک خشک علمی مباحثہ کے ایک زندہ سوال بن کر سامنے آتا ہے اور پڑھنے والے کو مجبور کرتا ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی جواب دے۔ پنڈت جواہر لال کے دل اور دماغ دونوں مشتعل ہیں اور ان کے مضامین میں ان کے خیالات اور جذبات اس خوبی سے سموئے ہوئے ہیں کہ ان کی نثر پر نظم کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہ دنیا کی باتیں لکھتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کوئی اپنا ذاتی نفسیاتی تجربہ بیان کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ الفاظ اس سلیقہ سے انتخاب کرتے ہیں کہ اظہارِ مفاہیم میں ایک برجستگی پیدا ہو جاتی ہے جو پڑھنے والے کے دل میں نشتر کی طرح اُترتی جاتی ہے۔ تیسری خصوصیت جس کا دراصل تعلق ان کی ذات سے ہے وہ ان کی حیرت انگیز 'بشریت' ہے (میں نے انسانیت کہنے سے جان بوجھ کر گریز کیا ہے کیونکہ بیجا استعمال کی کثرت سے انسانیت محض چند خشک نیکیوں کے مجموعہ کا نام ہو کر رہ گئی ہے جس کی نہ میرے دل میں کوئی قدر ہے اور نہ عظمت)۔ اِس بشریت نے ابھی تک اور سیاسی رہنماؤں کی طرح ان کے دماغ کی برودت کو ان کے دل کی حرارت پر غالب آنے نہیں دیا ہے۔

یہی بشریت ہے جس نے انھیں ایک خدائی فوجدار بنا رکھا ہے۔ جو ہر زبردست کے خلاف ہو کر زیردست کی طرف سے انھیں آواز بلند کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اور جو غم کی تاریک سے تاریک رات میں یاس و حرماں میں ڈوبے ہوئے دلوں کو بھی ایک نکلنے والے آفتاب کی کرن بن کر امید اور زندگی کا پیام دیتی ہے۔ اس بشریت نے ان کی طرزِ تحریر میں ایک عجیب و غریب شگفتگی اور شوخی پیدا کر دی ہے جسے جیلخانے کی اونچی دیواریں بھی دبا نہیں سکتیں اور جس کی ترجمانی کرنا میرے ایسے ترجمہ کرنے والے کے بس کی بات نہیں۔

(۶)

میں نے ان خصوصیتوں کا ذکر محض اس غرض سے کیا ہے تاکہ پڑھنے والوں کو ترجمہ کی مشکلوں کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ پھر بھی اپنی بساط بھر میں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ لکھنے والے کا کوئی نازک سے نازک مفہوم اور لطیف سے لطیف اشارہ ضائع نہ جائے۔ ساتھ ہی ساتھ زبان کی روانی قائم رہے اور پڑھنے والے کو یہ محسوس نہ ہو کہ وہ ایک ترجمہ پڑھ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان چند مقامات پر جہاں پنڈت جی نے اپنے مضامین میں انگریزی نظموں کے کچھ حصے شامل کر دیے ہیں میں نے بھی اپنے زعم میں ان کا ترجمہ اردو نظم ہی میں کیا ہے۔ میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا اندازہ پڑھنے والے ہی کر سکتے ہیں۔ میں اپنی رائے خود ظاہر کرنا نہیں چاہتا کیونکہ وہ غیر جانب دار نہیں کہی جا سکتی۔

جن مضامین کو اس مجموعہ میں شامل کیا گیا ہے وہ ان تین کتابوں سے لئے گئے ہیں۔

Recent Essays & Writings (۱)

Eighteen Months in India (۲)

India And The World (۳)

یوں تو پنڈت جواہر لال ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں اور ان کے تمام مضامین کا ترجمہ کرنا کم سے کم میرے لئے ایک ناممکن بات ہے کیونکہ نہ تو میرے پاس اتنا وقت ہے اور نہ اتنی قابلیت کہ جس تیزی سے وہ لکھتے ہیں اسی تیزی سے ان مضامین کا ترجمہ کر سکوں۔ اس کے علاوہ اگر ان سب کا ترجمہ کیا جاتا تو کئی جلدوں کی نوبت آجاتی۔ اِس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ صرف چند مضامین کا انتخاب کر کے ترجمہ کیا جائے۔ انتخاب کرنا کچھ آسان کام نہ تھا کیونکہ ان کے ہر مضمون میں ایک دلکشی ہے اور پڑھنے والے کے دل و دماغ کے لئے ایک خاص پیام۔ ایسی صورت میں انتخاب کرتے وقت میں نے دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ اوّل تو میں نے وہ مضامین انتخاب کئے ہیں جو میری رائے میں ان کے شاہکار کہے جا سکتے ہیں، جن میں انھوں نے ہماری سیاسی یا اقتصادی زندگی کے اہم سوالات کا حل پیش کیا ہے اور پس پردہ کام کرنے والی حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔ ہم

ان کی رائے مانیں یا نہ مانیں۔ انھیں نتیجوں پر خود پہونچیں یا نہ پہونچیں لیکن ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو حل وہ پیش کرتے ہیں وہ ایک مخصوص نظریہ کی بہترین ترجمانی کرتا ہے اور ہمارے لئے ان کی دلیلوں کا جواب دینا آسان نہیں۔ دوسرے وہ مضامین ہیں جن میں انھوں نے کسی قدر اپنی ذات کو نمایاں کیا ہے اور ہمیں یہ موقع دیا ہے کہ ہم ایک حد تک ان کے قریب پہونچ سکیں۔ انھیں پڑھ کر ہمیں ان کی ذاتی کشش کا احساس ہوتا ہے اور وہ ہمارے ذہنی احترام کی حدوں سے کہیں آگے بڑھ کر ہمارے دلوں میں بھی اپنا گھر کر لیتے ہیں۔ وہ محض ہمارے سیاسی رہنما ہی نہیں رہتے بلکہ ایک ایسے رفیق بن جاتے ہیں جس سے ہم زندگی کے دُکھ سُکھ میں ایک ہم آہنگی محسوس کرنے لگتے ہیں۔

(۸)

غالباً میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے لکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ 'مضامین نہرو' کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ روے زمین کے ہر حصے میں یہ پڑھے جا چکے ہیں اور مظلوم اور مایوس انسانیت ان سے شمع ہدایت کا کام لے رہی ہے لیکن اس رسم زدہ دنیا کو کیا کیا جائے؟ پریس والوں کی ضد ہے کہ جب تک میں چند سطریں بطور تمہید کے نہ لکھوں گا وہ کتاب شائع نہ کریں گے۔ باغوں میں اکثر لہلہاتے ہوئے پھولوں کے تختوں میں ایک بانس کی کھپچی لگی ہوتی ہے۔ ایک موٹے کاغذ کا چھوٹا سا چوکور ٹکڑا اس کھپچی میں بندھا ہوتا ہے جس پر ان پھولوں کی

رسم اور ستم لکھا ہوتا ہے۔ پھولوں کے شیدائی جو اس باغ میں آتے ہیں وہ بھول کر بھی اُس کھیچی پر نظر نہیں ڈالتے۔ لیکن باغ کی رسم کا یہی تقاضا ہے کہ وہ کھیچی ضرور لگائی جائے۔ مالی کی اس ستم ظریفی سے اس کھیچی کے دل پر جو کچھ گزرتی ہے اُس کا اس وقت میں بخوبی اندازہ کر سکتا ہوں۔

(۹)

مجھے جو کچھ لکھنا تھا میں لکھ چکا اور میں سمجھا تھا کہ اب میں نے فراغت پائی۔ لیکن علی حسین اب بھی اطمینان سے دم لینے نہیں دیتے۔ فرما رہے ہیں کہ ابھی دوسری جلد باقی ہے۔ خیر دیکھا جائے گا۔

آنند نرائن مُلّا

۳۱ اکتوبر ۱۹۴۰ء

مضامین [illegible]

ہندوستان کدھر؟

جیل خانہ سے تازہ چھوٹا ہوا قیدی زندگی اور سیاست کی کشمکس اور سختیوں سے ایک عرصہ سے کنارہ کش تو ضرور ہوتا ہے لیکن اسی وجہ سے اُس کو ایک قسم کی فوقیت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ ایک بیگانہ وار نظر ڈال سکتا ہے۔ وہ وقتی اختلافات میں اتنا محو نہیں ہو جاتا ہے جس وقت کہ اور لوگ حکمت عملی کی ادنیٰ مصلحتوں میں اُلجھے ہوتے ہیں وہ اصولوں پر نظر جما سکتا ہے۔ اس کو کچھ وہ حقیقتیں بھی نظر آجاتی ہیں جو ہر وقت بدلنے والے مظاہرات کی تہ میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔

اکثر لوگ سوال کرتے ہیں کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے۔ جو لوگ کہ اس کا جواب دے سکتے ہیں ان میں سے زیادہ تر یا تو جیل خانوں میں بند ہیں یا ان کے منہ سی دیئے گئے ہیں لیکن ہمارے حکام اور اُن کے وفادار خدام ہم کو مخلصانہ مشورہ جس میں دھمکیوں کا بھی پہلو ہوتا ہے برابر مفت دیئے چلے جا رہے ہیں۔ وہ کبھی ہم کو آگاہ کرتے ہیں کبھی ڈراتے ہیں۔ کبھی سمجھاتے ہیں اور کبھی بہلانے کی

کوشش کرتے ہیں کیونکہ ابھی وہ یہ طے نہیں کر سکے ہیں کہ ہمارے دلوں کو مسحور کرنے کے لئے کون سا طریقہ سب میں زیادہ مناسب اور کارگر ثابت ہوگا۔ آئیے تھوڑی دیر کے لئے ہم ان کو اور ان کے مشوروں کو بھول جائیں۔ کیونکہ ایسے تحفے اگر مفت بھی ملیں تو مشکوک ہیں۔

صحیح طرزِ عمل بغیر غور و فکر کئے ہوئے یکایک پیدا نہیں ہو سکتا۔ جو خیال کہ سعی میں تبدیل نہ ہو وہ ناقص اور نامکمل ہے۔ جو سعی کہ فکر کا نتیجہ نہیں وہ بے ترتیب اور لاحاصل ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم ان تمام اُلجھے ہوئے جالوں کو جو کہ ہمارے دماغوں میں لگے ہوئے ہیں نوچ کر پھینک دیں موجودہ گتھیوں کو سُلجھانے کی کوشش نہ کریں اور تھوڑی دیر کے لئے موجودہ مشکلات اور آئے دن کی پریشانیوں کو بھول کر اپنی نظر بنیادی باتوں اور اصولوں کی طرف لے جائیں۔

چونکہ قومی اخباروں پر ایک مدت سے میری نظر نہیں پڑی ہے لہذا میں اس مسئلہ پر کچھ کہتے ہوئے ایک ہچکچاہٹ سی محسوس کرتا ہوں لیکن میرا دل یہی کہتا ہے کہ ان بنیادی باتوں اور اصولوں پر کوئی توجہ نہیں کرتا۔ ممکن ہے کہ محتسبِ اشاعت کا حکم یا خوف ایک حد تک اس کا ذمہ دار ہو لیکن میرے نزدیک یہ کافی وجہ نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کو وائسرائے سے ملنا چاہیئے یا نہیں! اسٹینلے بالڈون (Stanley Baldwin) جیتنگے یا ونسٹن چرچل! (Winston churchill)

سر سیمول ہور (Sir Samuel Hoare) نے کیا کیا یا کیا نہیں کیا! کیا ہم کو وہ عجیب و غریب چیز یعنی وسطی ذمہ داری ملے گی کہ نہیں، یہی باتیں ہماری نظر کے سامنے رہتی ہیں اور اپنے مقصد اور اصلی نزاع کی طرف بھولے سے بھی خیال نہیں جاتا۔

اپنی تمام عمر میں دنیا کی وہ غیر مستقل حالت کبھی نہیں رہی جیسی کہ آج ہے۔ آج تک دنیا نے اس طرح اپنے دل کا جائزہ نہیں لیا، اور نہ ایسے شکوک اور شبہات پیدا ہوئے، جن سے اُس کا دماغ چکرا جائے۔ کبھی اس طرح پُرانے نظام کو جانچنے کی کوشش نہیں کی، اور نہ کبھی اس طرح موجودہ خرابیوں پر اور اُن کے دُور کرنے کی تدبیروں پر غور کیا۔ دنیا کی سطح پر ایک مسلسل انقلابی لہر دوڑتی چلی جا رہی ہے۔ اور ہر ملک کے فکرمند مدبّر جن کی عقلیں قریب قریب جواب دے چکی ہیں۔ اس کے اسباب اندھوں کی طرح اندھیرے میں ٹٹول رہے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہم بھی دنیا سے کچھ علیحدہ نہیں، اور دنیاوی واقعات سے متاثر ہونا بھی ہمارے لئے ضروری ہے لیکن جس بے حسی سے ہم ہندوستان میں ان باتوں پر توجہ دیتے ہیں اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے ہم سے ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اخباروں میں اہم واقعات شائع ہوتے ہیں لیکن کوئی پس پردہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ یہ واقعات کیوں ظہور پذیر ہوئے کوئی سمجھتا نہیں

چاہتا ہے کہ وہ کون طاقتیں ہیں جو دنیا کو ہلائے ہوئے ہیں اور ہماری آنکھ کے سامنے اُس شکل تبدیل کر رہی ہیں۔ اور نہ کوئی اخلاقی، اقتصادی اور سیاسی حقیقتوں کی تہ تک پہونچنا چاہتا ہے۔ تاریخ چاہے وہ گذشتہ ہو، یا موجودہ، ہماری نظروں میں محض ایک جادو کا تماشا بنی ہوئی ہے، جس میں کسی واقعہ کے لئے کوئی وجہ یا سبب نہیں ہے۔ اور نہ جس سے آئندہ کی منزلیں طے کرنے میں ہمیں کوئی سبق حاصل کرنا ہے۔ ہندوستان اور انگلستان کی آراستہ اور نمائشی اسٹیج پر چند کٹھ پتلیاں تھوڑی دیر کے لئے مدبرانہ صورت بنا کر چل پھر رہی ہیں۔ گول میز کے موکل جن میں کہ اُن کے بنانے والوں کے خدوخال دُھندلے دُھندلے نظر آتے ہیں، ایک فضول اور لاتناہی بحث میں، جس میں نہ کسی کو دلچسپی ہے اور جس کا نہ کسی پر اثر ہے، اُلجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی ساری فکر یہی ہے کہ کسی مخصوص گروہ یا طبقے کے حاصل شدہ حقوق کی پاسداری کس طرح کی جائے۔ اور پلاؤ قورمہ اُڑانے کے علاوہ ان کی سب میں بڑی تفریح خودستائی ہے۔

کچھ ایسے بھی ہیں کہ جو اپنی معصومیت اور بھولے پن سے پچھلے سال کے تمام واقعات بھُلائے بیٹھے ہیں۔ اور ابھی تک ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ اور جب کوئی اُن کی باتیں سننے کو تیار نہیں ہوتا تو انھیں تعجب بھی ہوتا ہے اور غصہ بھی چڑھتا ہے۔ رفتار زمانہ، جنگ عظیم

اور انقلاب دنیا کی پے در پے اور سنگین ضربیں بھی اُن کی پتھریلی کھوپڑیوں پر کسی قسم کی خفیف سے خفیف خراش ڈالنے میں ناکامیاب رہی ہیں۔ چند ایسے ہیں جو اپنے ذاتی اغراض و مقاصد، فرقہ بندی اور قومیت کے پردے میں چھپائے ہوئے ہیں۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جن کے دل میں ایک موہوم قوم پرستی کا جذبہ ہے۔ جو موجودہ حالت سے بیزار ہیں۔ اور بغیر صاف طور پر یہ سمجھے ہوئے کہ آزادی کیا شکل اختیار کرے گی قومی آزادی کے طلبگار ہیں۔ ان کے علاوہ وہ تمام کیفیات جو قومیت کی ترقی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ دیگر ملکوں کی طرح یہاں بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً ایک مقصد پرستی، ایک روحانیت، ایک وجدانی کیف، ایک ملک کے پیام میں دل سے یقین اور ایک قسم کے مذہبی جوش کی تجدید۔ دراصل یہ سب درمیانی طبقے کے ذہنی تاثر کے مظاہرات ہیں۔

ہماری سیاست کو یا تو جادو کا کھیل ہونا چاہیے، یا اُس کی بنا کسی اصول اور حکمت پر قائم ہونی چاہیے۔ پہلی بات میں تو ظاہر ہے کہ نہ منطق کا دخل ہے اور نہ کسی بحث کی ضرورت۔ لیکن دوسری بات کم سے کم تخئیلی حیثیت سے پورے طور پر عقل کی صاف بینی اور واقعات سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی قابلیت پر مبنی ہے۔ اُن موہوم اصولوں کی جن سے دماغ پریشان ہو جائے یا نظر دھندلی پڑ جائے، چاہے وہ کتنے ہی

تابع مقصد پرستی کیوں نہ ہوں، یا اُن کی بنا مذہب اور احساسات ہی پر قائم کیوں نہ ہو، اس میں کوئی گنجائش نہیں۔ ذاتی طور پر جادو اور مذہب کے طریقوں پر نہ تو مجھے بھروسہ ہے اور نہ میں انھیں کار آمد سمجھتا ہوں۔ میں تو اس معاملے پر محض حکیمانہ اصول سے روشنی ڈال سکتا ہوں۔

ہاں تو پھر ہم کیا چاہتے ہیں۔ آزادی! سوراج! خود مختاری! ڈومینین اسٹیٹس (Dominin Status)۔ یہ سب الفاظ ہیں۔ جن کے بہت کچھ معنی ہو سکتے ہیں اور کچھ بھی معنی نہیں۔ مصر آج خود مختار ہے اور پھر بھی جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے اس کی موجودہ حالت ایک دیسی ریاست سے کچھ ہی بہتر ہے۔ ایک قوم پر اس کی مرضی کے خلاف برطانوی مدد سے ایک غیر ذمہ دارانہ شخصی حکومت قائم کی گئی ہے۔ اقتصادی حیثیت سے مصر کو یورپ کی چند سامراجی طاقتوں کی خصوصاً برطانیہ کی نوآبادی سمجھنا چاہیئے۔ جنگ عظیم کے زمانے سے مصر کی قومیت میں اور اُس کی حکمران طاقت میں برابر پرخاش رہی اور یہ آج تک جاری ہے۔ اس طرح باوجود خود مختار کہلانے کے مصر کو ابھی قومی آزادی تک نصیب نہیں ہے۔

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس کی آزادی کے لئے ہم خاص طور پر کوشاں ہیں کیونکہ قومیت ایک وسیع لفظ ہے اور ایسے عناصر کا مجموعہ ہے جو ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ والیان ملک، بڑے اور چھوٹے زمیندار،

پیشہ ور طبقہ، کسان، اہل حرفہ و تجارت، ساہوکار، معمولی حیثیت کے آدمی، غریب اور مزدور سب ہی اس کے اجزا ہیں۔ اس میں ہندوستانی اور ولایتی سرمایہ دار، دیسی اور پردیسی اہلکار سب کی اغراض شامل ہیں۔ قوم پرست اس سوال کا اس سے زیادہ جواب نہیں دیتے کہ ہم دیسی اغراض کو پردیسی اغراض پر ترجیح دیں گے۔ وہ موجودہ سماجی نظام اور طبقہ وارانہ تفریق کو ٹھیس پہونچانا نہیں چاہتے۔ وہ یہ سوچ لیتے ہیں کہ جب ملک آزاد ہو جائے گا تو کسی نہ کسی طرح ان تمام مختلف اغراض میں ایک طرح کا سمجھوتہ ہو جائے گا۔ قوم پرستی چونکہ دراصل درمیانی طبقہ کی تحریک ہے اس واسطے اس طبقہ کی اغراض خاص طور پر نظر کے سامنے رکھتی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ان مختلف اغراض میں ایک دوسرے سے سخت مخالفت ہے اور ہر قانون یا طرز حکومت جو ایک کے لئے مفید ہے وہ دوسرے کے لئے مضر ہے۔ جو بات کہ کسی والی ملک کو پسند ہو اس کی رعایا کو ناگوار ہو سکتی ہے۔ جو چیز کہ زمیندار کے لئے مفید ہے اس کے کاشتکاروں کو تباہ و برباد کر سکتی ہے۔ جو آئین کہ پردیسی سرمایہ کے مطالبات پورے کرے گا وہ ملک کی کمزور حرفتوں کا گلا گھونٹ سکتا ہے۔

اس سے زیادہ مہمل کوئی خیال نہیں کہ قوم کے تمام اغراض بغیر کسی کی دل آزاری کئے ہوئے پورے کئے جا سکتے ہیں۔ ہر قدم پر ایک کے لئے

دوسرے کو بھینٹ چڑھانا پڑتا ہے۔ کرنسی کا آئین قرضخواہ اور مقروض دونوں کو ایک وقت میں فائدہ نہیں پہونچا سکتا۔ روپیہ کی قیمت اگر گھٹا دی جائے تو مقروض یقیناً خوش ہوں گے کیونکہ اُن کے قرضے یا تو مسٹ جائیں گے یا نام کو رہ جائیں گے۔ اور اہل حرفت بھی عام طور پر اسے پسند کریں گے لیکن مہاجن اور ساہوکار یا وہ لوگ جن کی آمدنی مستقل ہے اُن کی ناراضگی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوگا۔ اُنیسویں صدی کے آغاز میں انگلستان نے جان بوجھ کر اپنے اہل زراعت کو اپنے اہلِ حرفت پر قربان کر دیا۔ ابھی چند سال کی بات ہے ۱۹۲۵ء میں پاؤنڈ اسٹرلنگ کی قیمت قائم رکھ کر اُس نے کسی حد تک اپنے اہل حرفت کو اپنے مہاجنی اصول اور ساہوکارانہ نظام کے بھینٹ چڑھا دیا اور یہی وجہ تھی کہ مزدوروں میں اتنی ہلچل مچی اور اتنی بڑی ہڑتال ہوئی۔

ایسی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ یہ تو با اختیار طبقہ کے دو مختلف گروہوں کے مخالفانہ مقاصد کی نظیریں ہیں۔

اغراض کی اس سے بھی زیادہ سنگین لڑائی اس وقت ہوتی ہے جبکہ با اختیار طبقہ مجموعی حیثیت سے باقیماندہ افراد کے خلاف محاذ تیار کرتا ہے۔ جبکہ وہ جنگ ہوتی ہے جس میں برسرکار ایک طرف اور بیکار دوسری طرف ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات بخوبی ظاہر ہے لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں طاقت ہوتی ہے چاہے وہ سیاسی ہو یا اقتصادی وہ ہر امکانی کوشش

کرتے ہیں کہ اصل نزاع پر لوگوں کی نظر نہ جائے۔ حکومت برطانیہ خدا کو حاضر و ناظر بنا کر زبان سے برابر یہی کہے چلی جا رہی ہے کہ اس ملک کے بے زبان باشندوں کی وہی ولی ہے اور انگلستان اور ہندوستان کی اغراض مشترک ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈال کر ایک مشترک منزل مقصود تک جا سکتے ہیں۔ ان باتوں میں صرف چند ہی آدمی آ سکتے ہیں کیونکہ قومیت ہم کو اتنا ضرور بتاتی ہے کہ ہمارے اور برطانوی اغراض میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن یہی قومیت ہم کو اُس فطری اور اصولی اختلاف کے سمجھانے میں جو کہ ملک کی مختلف اقتصادی اغراض میں ہے کوتاہی کرتی ہے۔ اس اختلاف کو ہمیشہ یہ کہہ کر کہ قومی آزادی کا مسئلہ پہلے طے ہونا چاہیے دبانے کی اور چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہمیشہ مختلف طبقوں اور گروہوں سے مشترکہ قومی دشمن کے خلاف متفق اور متحد ہونے کی التجا کی جاتی ہے اور جو لوگ کہ زمیندار اور کاشتکار اور مزدور اور سرمایہ دار کی فطری مخالفت دکھانا چاہتے ہیں وہ اعتراض کر کے خاموش کر دئے جاتے ہیں۔

ہم یہ مانے لیتے ہیں کہ عام طور پر کوئی آدمی لڑائی جھگڑا یا مسلسل کشیدگی پسند نہیں کرتا۔ وہ صلح اور سکون چاہتا ہے اور اس کے لئے بہت کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک ایسی لڑائی اور بدنظمی کی طرف سے جان بوجھ کر آنکھیں پھیر لینا جو محض موجود ہی نہیں بلکہ جو ہمارے سماجی نظام کی جڑ کھودے ڈال رہی ہے

کوئی دانائی نہیں اور اس کا نتیجہ یقیناً تباہی ہے۔ اس طرح نہ تو یہ کشاکش دُور ہو سکتی ہے اور نہ آنکھیں بند کرنے سے حقیقت مجاز میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہم اس کو بھول نہ جائیں اور اُس کو ذہن میں رکھتے ہوئے آزادی کے خیال کو تشکیل دیں۔ ہم کو اس سوال کا جواب کہ ہم کس جماعت یا کن جماعتوں کی آزادی کے لئے خاص طور پر سرگرم ہیں ضرور دینا پڑے گا۔ ہم اس کا جواب دینے سے بچ نہیں سکتے۔ آج نہیں تو کل جواب دینا ہوگا۔ کیا ہم کاشتکاروں اور مزدوروں کے جمِ غفیر کو اپنی فہرست میں سب سے پہلی جگہ دیتے ہیں یا کسی دوسری چھوٹی جماعت کو؟ ہم جتنے بھی گروہوں یا جماعتوں کو آزادی کی نعمت دے سکیں ضرور دیں لیکن یہ نہ بھول جائیں کہ دراصل ہم کس کے طرفدار ہیں اور اگر ان گروہوں کی اغراض میں اختلاف پیدا ہوا تو ہم کو کس کا ساتھ دینا ہے! یہ کہنا کہ ہم اس سوال کا جواب نہیں دیں گے یہ بھی اک جواب ہے کیونکہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہم موجودہ نظام کی برقراری کے حامی ہیں۔

حکومت کی ظاہری صورت تو بالآخر مقصد براری کا محض ایک طریقہ ہے۔ اور یوں تو آزادی خود ایک ذریعہ ہے جس کا مقصد انسانی بہتری اور انسانی ترقی۔ جس کا نصب العین افلاس بیماری اور مصیبت کو دور کرنا ہے اور ہر انسان کو جسمانی، دماغی اور روحانی اعتبار سے ایک "اچھی زندگی" بسر کرنے کے قابل بنانا ہے۔ 'اچھی زندگی' کی کیا تعریف ہے یہ یہاں بیان کرنے کا

موقع نہیں لیکن اس بات پر زیادہ تر لوگ متفق ہوں گے کہ اس کے لئے آزادی لازمی ہے۔ قوم کے لئے قومی آزادی اور فرد کے لئے شخصی آزادی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہر قسم کی رکاوٹ یا بندش ترقی کی دشمن ہے۔ اور اقتصادی بدنظمیوں کے علاوہ یہ قوم اور فرد دونوں کی طبیعت اور ذہنیت پر بُرا اثر ڈالتی ہے اور مختلف قسم کی بدمزاجیاں یا غیر فطری رجحانات پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا آزادی تو ضروری ہے لیکن معاونت کی اہلیت اور خواہش بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ موجودہ زندگی اتنی پیچ در پیچ ہے اور اس کا دارومدار اس قدر ایک دوسرے پر ہے کہ محض تعاون کی برکت ہے کہ آج اس کے جسم میں روح نظر آتی ہے۔

تاریخ کے صفحات میں ہم کو مختلف اقسام کے طرز حکومت کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے۔ اور نظام سلطنت اور پیداوار کے تبدیل ہوتے ہوئے اقتصادی طریقے بھی نظر آتے ہیں۔ یہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ جب اقتصادی تبدیلی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ جاتی ہے۔ اور طرز حکومت اپنی جگہ پر قریب قریب غیر متحرک رہ جاتی ہے تو دونوں کے بیچ میں ایک کھائی پیدا ہو جاتی ہے جس کو صرف ایک انقلاب پاٹ سکتا ہے۔ تاریخ اور طرز حکومت کی تشکیل میں جو زبردست اہمیت اقتصادی معاملات کی ہے اس سے آج کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

ہم کو اکثر بتایا جاتا ہے کہ مشرق اور مغرب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مغرب کو مادّہ پرست کہا جاتا ہے۔ اور مشرق کو روحانیت اور مذہبیت کا گھوارہ قرار دیا جاتا ہے۔ لفظ مشرق سے دراصل کیا مراد ہے اس کا پتہ بڑی مشکل سے چلتا ہے کیونکہ اس لفظ میں عربی ریگستانوں کے بدو۔ ہندوستان کے ہندو۔ سائبیریا کے جنوبی میدانوں کے خانہ بدوش۔ منگولیا کی گلہ بان قومیں۔ چین کے اسلاف پرست کافر۔ اور جاپان کے پشتینی امراسب شامل ہیں۔ ان مختلف ایشیائی ممالک میں بھی یورپ کے ملکوں کی طرح بڑے زبردست قومی اور معاشرتی اختلافات موجود ہیں۔ لیکن مشرق اور مغرب دو بالکل مختلف چیزوں کی حیثیت سے محض ان لوگوں کے دماغ میں ہیں جو یا تو سامراجی حکومت کے لئے بہانے تلاش کرتے ہیں یا جن کو یہ خیال بطور قصہ یا روایت کے اپنے پریشان خیال بزرگوں سے ترکہ میں ملا ہے۔ اختلافات تو یقیناً ہیں لیکن یہ زیادہ تر اقتصادی ترقی کی مختلف منزلوں پر ہونے کی وجہ سے ہیں۔

مغربی و شمالی یورپ میں غیر ذمہ دارانہ شخصی حکومت کے بجائے موجودہ نظام سرمایہ داری۔ عنانِ سلطنت سنبھالتا نظر آتا ہے۔ اس نظام کی خصوصیت ہے کہ ایک مقابلے کی صورت پیدا ہو اور ایک بڑے پیمانے پر چیزیں تیار کی جائیں۔ کم حیثیت والے مٹ جاتے ہیں۔ چھوٹے موٹے دوکانداروں کی گزر نہیں۔ اور جوڑ کاٹ میں کہ رعایا اور کسانوں پر جاگیردارانہ نظام میں تھیں وہ دُور

ہو جاتی ہیں۔ اور ان کاشتکاروں کی رہی سہی زمین بھی چھن جاتی ہے۔ ایک کثیر التعداد جماعت بے روزگار ہو جاتی ہے اور ان کے پاس اب زمین بھی نہیں ہوتی کہ اُسی کو بو، جوت کر اپنا پیٹ پال سکیں۔ اس طرح عوام کا ایک بڑا طبقہ تیار ہو جاتا ہے جس کے پاس نہ زمین ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کی جائداد۔ ساتھ ہی ساتھ جو بندشیں کہ جاگیر دارانہ نظام میں اشیاء کی قیمت پر تجارت کے محدود ہونے کی وجہ سے تھیں ہٹ جاتی ہیں اور ایک بازارِ عام کی بنا پڑتی ہے۔ یہی بڑھ کر بازارِ دنیا بن جاتا ہے جو کہ نظام سرمایہ داری کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

نظام سرمایہ داری کی بنا دو چیزوں پر ہے۔ ایک تو وہ کثیر جماعت جس کے پاس زمین نہیں ہے اور جو کارخانوں میں بحیثیت مزدور کے نوکری کرنے پر مجبور ہے۔ دوسرے وہ بازارِ عام جہاں مشین کی بنائی ہوئی اشیاء فروخت کی جا سکتی ہیں۔ یہ بہت جلد بڑھتا ہے اور ساری دنیا پر چھا جاتا ہے۔ اُن ممالک میں جہاں اس کی تخلیقی صورت ہے اس کے بدن میں جستی ہے اور اس کے خون میں روانی ہے۔ لیکن اُن ملکوں یا نوآبادیوں میں جہاں اس کی مغربی مشینوں کی اشیائے ساختہ صرف خریدی اور استعمال میں لائی جاتی ہیں اس کی کیفیت محض ایک مجہول کی سی ہے۔ مغربی شمالی یورپ اور اُس کے کچھ بعد سے شمالی امریکہ تمام دنیا کی آمدنی کے ذرائع خاص اپنی

منفعت کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ وہ ایشیا۔ افریقہ۔ مشرقی یورپ اور جنوبی امریکہ سے ناجائز فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ انھوں نے دنیا کی دولت میں اضافہ تو بہت کچھ کیا ہے لیکن یہ دولت صرف چند قوموں اور چند ہاتھوں میں آگئی ہے۔

سرمایہ داری کی اس ترقی میں انگلستان کے لئے ہندوستان پر قابو جمائے رکھنا نہایت درجہ اہم ہے۔ ہندوستان کی دولت نے شروع شروع میں تو انگلستان کی صنعتی ترقی میں مدد دی اور اس کے بعد ہندوستان برطانوی کارخانوں کے لئے جنس خام کا ایک وسیع گدام اور برطانوی اشیائے ساختہ کے لئے ایک بہت بڑا بازار بن گیا۔ انگلستان کو دولت جمع کرنے کی خواہش اتنی دل سے لگ گئی کہ اُس نے اپنے اہل زراعت کو اہل صنعت پر قربان کر دیا۔ انگلستان مثل ایک بڑے شہر کے بن گیا اور ہندوستان اس کی آراضی ملحقہ بن کر رہ گیا۔

اس طرح دولت کا صرف چند ہاتھوں میں یکجا ہوتا رہنا برابر جاری رہا۔ لیکن انگلستان، ہندوستان اور دیگر ممالک سے اس قدر بے حساب دولت مار لایا تھا کہ اس کا کچھ نہ کچھ حصہ مزدوروں تک بھی پہونچا اور ان کا معیار زندگی بلند ہونے لگا۔ سرمایہ داروں کا نفع اتنا کثیر تھا کہ وہ آسانی سے مزدوروں کے ساتھ وہ رعایتیں کر سکتے تھے جس سے ان کا جوش ٹھنڈا ہو گیا

اور ان کا اضطراب جاتا رہا۔ تنخواہیں بڑھیں۔ کام کرنے کے اوقات کم ہوئے۔ بیمہ کا رواج اور دیگر تدابیر کارخانہ کے کام کرنے والوں کی رفاہ اور آسائش کے لئے عمل میں لائی گئیں۔ انگلستان بھر پر ایک عام خوشحالی کا دَور دورہ ہوگیا جس سے کہ پیشہ ور مزدوروں کی بے اطمینانی بھی دب گئی۔

ہندوستان کی صنعتی ترقی یہ ہوئی کہ وہ غیر ملکی مشینوں کی تیار کردہ اشیا، کا خریدار بن گیا۔ اس مجہولانہ ترقی سے زمین پر بار برابر بڑھتا گیا۔ گاؤں والوں کی اپنی صنعتیں کچھ تو زبردستی مٹادی گئیں۔ اور کچھ اقتصادی طاقتوں کا مقابلہ نہ کرسکیں۔ لیکن ان کی جگہ کوئی اور ذریعہ معاش پیدا نہیں ہوا۔ صنعتی ترقی کے تمام آثار ملک میں موجود تھے لیکن انگلستان کی یہ مصلحت نہ تھی اور مشینوں پر ٹیکس لگا کر اسی بات کی کوشش کی گئی کہ صنعت کے یہاں قدم نہ جم سکیں۔ اس طرح زمین پر بار بڑھا اور ساتھ ہی ساتھ افلاس اور بے روزگاری۔ ہندوستان بجائے صنعتی ترقی کرنے کے اور زیادہ زراعتی بن گیا۔

لیکن زیادہ عرصہ تک نہ تو تاریخی رفتار روکی جاسکتی ہے اور نہ اقتصادی تقاضا رد کیا جاسکتا ہے۔ باوجود اس کے کہ عامی مفلوک الحالی ترقی پر تھی چند چھوٹے چھوٹے گروہوں نے کچھ سرمایہ اکٹھا کیا اور اس کو کسی کام میں لگانا چاہا۔ اور اس طرح کچھ تو ہندوستانی سرمایہ سے لیکن زیادہ تر غیر ملکی سرمایہ سے ہندوستان کی اُس صنعت کا جس کا کہ مشینوں پر

دار ومدار ہے آغاز ہوا۔ ہندوستانی سرمایہ بہت کچھ غیر ملکی سرمایہ کے دست نگر ہے اور پورے طور پر بیرونی مہاجنی نظام کے قابو میں ہے۔ یہ بات سب کو بخوبی معلوم ہے کہ جنگ عظیم نے ہندوستانی صنعتوں کو کتنا فائدہ پہونچایا اور اس کے بعد سے سامراجی مصلحتوں کی بنا پر انگلستان نے ہندوستانی صنعتوں کے ساتھ جو اُس کا طرزِ عمل تھا اُسے تبدیل کر دیا۔ اب وہ اُس کی ترقی کا مددگار بن گیا لیکن زیادہ تر بدیسی سرمایہ سے نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی ایسی صنعتوں نے ترقی کی جو محض نام کے لئے سدیشی ہیں اور اس طرح برطانوی سرمایہ کی گرفت ہندوستان پر اور زیادہ مضبوط ہونے لگی۔

تمام مشرقی ممالک کی دولت جس کو کہ مغرب اُڑائے لئے جا رہا تھا اُس کا اس صنعتی ترقی اور قومی تحریکوں نے سدِ باب کیا اور اس طرح مغربی سرمایہ کا نفع کم ہونے لگا۔ لڑائی کے نتائج اور قرضے یوں ہی ممالک متعلقہ کے لئے ایک بڑا زبردست بار تھے۔ دولت بھی اتنی نہیں رہی تھی اور نہ اتنی نفع کی آمدنی تھی کہ پیشتر کی طرح مغربی کارخانوں کے کام کرنے والوں کو تقسیم کی جا سکے۔ اس سے مزدوروں کی شورش اور مطالبات بڑھے۔ اس کے علاوہ ان کے جوش کو اُبھارنے اور انھیں ترغیب دینے کے لئے روسی انقلاب کی زندہ مثال آنکھوں کے سامنے تھی۔

اسی دوران میں دو باتیں اور خاموشی کے ساتھ مگر بہت تیزی سے

رونما ہو رہی تھیں۔ ایک تو بڑے بڑے ٹرسٹ، کاروباری معاہدے۔ اور ساجھے داریاں قائم کی گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت اور طاقت سمٹ کر صرف معدودے چند لوگوں کے ہاتھ میں آگئی۔ دوسرے اشیا کی طرز ساخت کی روز افزوں ترقی اور تبدیلی کی وجہ سے انسانی کام کرنے والوں کی جگہ رفتہ رفتہ مشینوں نے لے لی اور اس طرح برابر مزدوروں کی ایک تعداد بے روزگار ہوتی چلی گئی۔ ان باتوں کا ایک عجیب نتیجہ نکلا۔ ٹھیک جبکہ صنعت اپنی تمام تاریخ حیات میں سب سے بڑے پیمانے پر چیزیں بنا کر بازار میں لا رہی تھی اُسی وقت بجز چند افراد کے ان کا کوئی گاہک نہ تھا کیونکہ زیادہ تر لوگ ان کے خریدنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔ بے روزگاروں کی فوجیں تیار ہو گئی تھیں اور ان کی کوئی آمدنی نہ تھی تو خرچ کہاں سے کرتے۔ اور کمانے والوں میں سے بھی زیادہ تر اس قابل نہ تھے کہ کچھ بچا سکتے۔ ایک نئی حقیقت ان صنعتی سپہ سالاروں کے چوندھیائے ہوئے دماغوں میں یکایک بجلی کی طرح کوندگئی (ہندوستان والوں پر ابھی یہ بے نقاب نہیں ہوئی ہے) اور وہ حقیقت یہ تھی کہ بےحساب تعداد میں چیزیں تیار کرنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ بے حساب تعداد میں یہ چیزیں خریدی جائیں اور استعمال میں لائی جائیں۔ لیکن اگر عوام کے پاس پیسہ نہیں ہے تو وہ انھیں کیسے خرید سکتے ہیں یا صرف میں لا سکتے ہیں! لہذا اور اشیا تیار کرنے سے کیا فائدہ!

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اشیا کا بنانا کم کر دیا جاتا ہے بلکہ قریب قریب روک دیا جاتا ہے۔ اس سے بے روزگاری اور پھیلتی ہے اور اس کی وجہ سے چیزوں کی بکری اور کم ہو جاتی ہے۔

سرمایہ داری پر یہ نازک وقت پچھلے چار سال سے کچھ زائد زمانے سے گزر رہا ہے جس کی وجہ سے غریب دنیا کو سانس لینا مشکل ہے۔ دراصل یہ دنیا کی دولت کی غلط تقسیم کا نتیجہ ہے۔ چونکہ یہ دولت صرف چند ہاتھوں میں جمع ہو گئی ہے۔ یہ بیماری سرمایہ داری ہی کا جوہر ہے یہ اسی کے سایہ میں پرورش پاتی ہے یہاں تک کہ یہ اسی نظام کا جو اسے وجود میں لایا خون چوس کر خاتمہ کر دیتی ہے۔ دنیا میں نہ دولت کی کمی ہے نہ اناج کی اور نہ اُن تمام چیزوں کی جن کی انسان کو ضرورت ہوتی ہے۔ آج دنیا جتنی دولتمند ہے اتنی کبھی نہ تھی اور عنقریب ہی اس سے بھی کہیں زیادہ ترقی کر جائے گی۔ یہ تو محض نظام کی خرابی ہے کہ ایک طرف تو کروڑوں آدمی فاقہ کشی کرتے ہیں اور بے آب و دانہ بسر کرتے ہیں اور دوسری طرف کھانے پینے کی چیزیں اور دیگر اشیا کثیر تعداد میں پھینک دی جاتی ہیں۔ کھیتوں میں زہریلے کیڑے پیداوار کو ضائع کرنے کے لئے جان بوجھ کر چھوڑے جاتے ہیں۔ فصلیں کاٹی نہیں جاتی ہیں اور مختلف قومیں مل کر اس بات کا مشورہ کرتی ہیں کہ آئندہ سالوں کی گیہوں، روئی،

چاء، قہوہ اور دیگر اشیا کی پیداوار کی روک تھام کس طریقہ سے کی جائے؟
اوائل زمانہ سے آج تک انسان قدرت کی طاقتوں سے اپنی زندگی کی محض ضروریات حاصل کرنے کے لئے لڑتا رہا اور اب جبکہ قدرت نے اپنی وہ دولت جو کہ دنیا سے مفلسی کو یک لخت مٹا دینے کے لئے کافی ہے اس پر نچھاور کردی اس نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ اس کو جلا دیا اور ضائع کردیا اور اس طرح پہلے سے بھی زیادہ غریب ورمفلوک الحال ہوگیا۔
تاریخ میں ایک کذب نما حقیقت کی اس سے زیادہ حیرت انگیز مثال نہیں ملتی۔ یہ بات بخوبی عیاں ہوگئی ہے کہ صنعت کا سرمایہ دارانہ نظام پیشتر جو کچھ بھی اس نے خدمتیں کی ہوں دنیا کی موجودہ تخلیقی ضرورتیں پوری نہیں کرتا۔ علمی اور فنی واقفیت ہماری موجودہ طرز معاشرت سے بہت آگے بڑھ گئی ہے اور پیشتر کی طرح موجودہ فساد کی وجہ یہی تفریق ہے جبتک کہ یہ دوری مٹائی نہ جائے گی اور کوئی ایسا نظام جس میں خیال کی نئی اصطلاحوں کی عملی گنجائش ہو رائج نہ کیا جائے گا یہ بدنظمیاں غالباً قائم رہیں گی۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ جن کی اغراض پرانے نظام سے وابستہ ہیں اس نئے نظام کی ضرور مخالفت کریں گے۔ حالانکہ یہ ان کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہا ہے اور جہاں تک ان سے ممکن ہوگا وہ اپنے محدود حقوق چھوڑ کر تمام حقوق میں حصہ بٹانے کو تیار نہ ہوں گے۔

یہ دراصل اخلاقی سوال نہیں ہے جیسا کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں لیکن اس کا ایک اخلاقی پہلو ضرور ہے۔ اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ سرمایہ دار پر لعنت بھیجی جائے اور سرمایہ داروں کو گالیاں دی جائیں۔ سرمایہ داری نے دنیا کی بڑی خدمت کی ہے اور انفرادی حیثیت سے سرمایہ دار ایک بڑی مشین کے چھوٹے چھوٹے پرزوں سے زیادہ باوقعت نہیں۔ سوال تو صرف یہ ہے کہ یہ واقعہ ہے کہ نہیں، کہ نظام سرمایہ داری کا اب زمانہ نہیں رہا اور اس کی جگہ ایک ایسے نظام کو لینی چاہیے جو انسانی معاملات کا نظام اس سے بہتر اور زیادہ معقول طریقے پر کرے اور جو انسانی واقفیت اور علمی ترقی کے دوش بدوش ہو۔

اس زمانے میں باوجود چند مقامات پر صنعتی ترقی ہونے کے ہندوستان کی زمین کا بار کم نہ ہوا بلکہ اور زیادہ ہو گیا۔ اقتصادی بدامنی اور پھیلی۔ درمیانی طبقہ بڑھا اور اپنی ترقی کی راہیں مسدود دیکھ کر سیاسی تبدیلیوں کا مطالبہ کرنے لگا اور شورش برپا کر دی۔ اسی قسم کے اسباب مشرق کے تمام مفتوح ممالک اور نوآبادیوں میں رونما ہوئے۔ خصوصاً لڑائی کے بعد مصر اور دیگر ایشیائی ممالک میں قومی تحریکیں بہت تیزی کے ساتھ زور پکڑنے لگیں۔ یہ تحریکیں دراصل عوام اور ادنیٰ حیثیت کے آدمیوں کی مفلوک الحالی اور مصیبت کا نتیجہ تھیں۔ ان تحریکوں کے طرز عمل میں بھی ایک حیرت انگیز مشابہت تھی وہی حکومت سے عدم تعاون۔ بدیشی مال کا بائیکاٹ۔ قانون ساز مجالس سے

گریز۔ اور ہر قسم کی ہڑتال وغیرہ۔ کبھی کبھی ان ہنگاموں میں تشدد بھی رونما ہو جاتا تھا جیسا کہ مصر اور سریا میں ہوا۔ لیکن عام طور پر امن کے طریقوں پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں تو گاندھی جی کی رائے سے عدم تشدد کانگریس کا بنیادی اصول بنا لیا گیا تھا۔ آزادی کے لئے یہ تمام قومی جدوجہد آج تک قائم ہیں اور جب تک کہ نظام دنیا کا اطمینان بخش فیصلہ نہ ہو جائیگا ان کا جاری رہنا لازمی ہے۔ یہ فیصلہ حقیقتاً محض حکومت خود اختیاری کی فطری خواہش کا پورا کرنا نہیں ہے بلکہ بھوکوں کا پیٹ کس طرح بھرا جائے اس سوال کا حل کرنا ہے۔

وہ زبردست انقلاب جس نے کہ لڑائی کے بعد کے زمانے میں ایشیا کے سینے میں ایک قومی اضطراب پیدا کر دیا تھا اس کا اثر رفتہ رفتہ زائل ہو گیا اور طبیعتیں سکون پذیر ہونے لگیں۔ ہندوستان میں اس نے اسمبلی اور کونسل میں سوراجسٹ پارٹی کے داخلے کی شکل اختیار کی۔ یورپ میں بھی ۱۹۲۵ء اور اس کے قریب کا زمانہ امن و سکون کا گزرا ہے جب جنگ عظیم کے بعد جو نئی صورتیں پیدا ہوئی تھیں ان کا جائزہ لیا جا رہا تھا اور اُن سے مناسبت پیدا کی جا رہی تھی۔ وہ انقلابی گھٹا جو یورپ پر ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء میں چھائی ہوئی تھی وہ برس نہ سکی اور بادل منتشر ہو گئے۔ امریکہ کی دولت نے یورپ کے خزانے معمور کر دئے اور ان لڑائی کے تھکے ماروں کی نظر کے سامنے

ایک خوش حالی کا سراب پھر پیش کر دیا۔ لیکن اس خوش حالی کی کوئی حقیقت نہ تھی اور جب ۱۹۲۹ء میں امریکہ نے یورپ اور جنوبی امریکہ کو روپیہ اُدھار دینا بند کر دیا تو یہ نمائشی عمارت یکایک بیٹھ گئی۔ اس حادثہ کے یوں تو بہت سے اسباب تھے لیکن یہ دراصل ایک زوال رسیدہ نظامِ سرمایہ داری کے فطری اختلافات کا نتیجہ تھا کہ یہ تاش کے پتوں کی لاٹ گرنی شروع ہو گئی۔ پچھلے چار سال سے یہ بڑی تیزی کے ساتھ گرتی چلی جا رہی ہے اور یہ رفتار ہنوز قائم ہے۔ کوئی اسے زمانۂ پستی کہتا ہے۔ کوئی اسے زوالِ تجارت سے تعبیر کرتا ہے۔ کوئی اسے محض بُرا وقت سمجھتا ہے لیکن دنیا مجبور ہو کر اس بات کا احساس کر رہی ہے کہ دراصل یہ نظامِ سرمایہ داری کے چراغِ سحری کی جھلملاہٹ ہے۔

بین الاقوامی تجارت قریب قریب ختم ہو چکی ہے۔ بین الاقوامی تعاون ٹوٹ چکا ہے۔ بازارِ دنیا جس کو تعمیرِ سرمایہ داری کا سنگ بنیادی کہنا چاہیے متزلزل ہو چکی ہے۔ اور ہر قوم کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ آیندہ کیا ہو گا یہ تو نہیں بتایا جا سکتا لیکن جو بات کہ یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام دنیا کی طاقتیں مل کر بھی اب اس پُرانے نظام کو برسرِ اقتدار نہیں کر سکتیں۔ جتنا ہی کہ پُرانا نظام زیادہ متزلزل ہوا اتنی ہی مزدور پیشہ گروہ کی مخاصمت اور سنگین ہو گئی۔ جب اس مخالفت نے زیادہ خطرناک صورت

اختیار کی تو اُس جماعت نے جو کہ قابض تھی اپنے جزئی تفرقہ بھلا دیے اور اس مشترک دشمن سے لڑنے کے لئے منظم ہوگئی۔ اس سے فاشزم کی بنا پڑی اور جہاں اس کا رنگ شوخ نہ ہونے پایا بلکہ ہلکا رہا وہاں اس نے اپنا نام قومی حکومت رکھ لیا۔ دراصل یہ قابض جماعت کی اپنی طاقت اور اپنا اقتدار قائم رکھنے کی آخری کوشش ہے۔ انیسوی صدی کی جمہوریت کے طریقے برطرف کر دیے جاتے ہیں اور لڑائی اور شدید ہو جاتی ہے۔ لیکن چاہے وہ فاشزم ہو یا قومی حکومت جب تک کہ وہ ان بنیادی اقتصادی اختلافات کو مٹانے کی کوئی صورت نہیں نکالے گی جو کہ نظام سرمایہ داری کے ضمیر میں شامل ہیں اس کو ناکامی ہی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ دولت کی ناہمواری اور اس کی مناسب تقسیم کے مسئلے کو تو حل کرنا ہی پڑے گا۔ ان بڑے ملکوں میں جہاں نظام سرمایہ داری رائج ہے امریکہ ہی صرف ایک وہ ملک ہے جہاں آج حکومت کی طرف سے دولت کی ناہمواری کو گھٹانے کی کسی قدر کوشش کی جا رہی ہے۔ پریسیڈنٹ روسولٹ کا پروگرام کا اگر مکمل طور پر نفاذ ہوا تو ایک قسم کی سلطنتی اشتراکیت کا ظہور ہوگا۔ زیادہ تر گمان تو اسی بات کا ہے کہ یہ کوشش ناکامیاب رہے گی اور فاشزم برسراقتدار آجائے گا۔ انگلستان حسبِ عادت ضد اور پراگندہ دماغی سے کام لے رہا ہے اور غیبی امداد کا منتظر ہے۔ اُس نے اسی زمانہ میں ہندستان کی

دولت اور دیگر ذرائع آمدنی سے بہت کافی فائدہ اٹھایا ہے لیکن یہ تو محض وقتی تسکین ہے۔ اور رفتہ رفتہ یہ تمام قومیں پھیلتی ہوئی کھائی کے کگارے تک آگئی ہیں۔

آج اگر ہم دنیا پر ایک نظر ڈالیں تو ہم یہ دیکھیں گے کہ سرمایہ داری نے اشیا کی ساخت کا مسئلہ تو حل کر لیا ہے لیکن جو اس مسئلہ کا ایک جزو ہے یعنی ان اشیا کی مناسب تقسیم اس کا انتظام کرنے میں قاصر رہی ہے۔ اس انتظام کے لئے سرمایہ داری فطری طور پر ناقابل ہے اور محض چیزیں بنانے سے دنیا کا میزان بگڑ جاتا ہے اور ایک پلہ جھک جاتا ہے اگر کوئی ایسی صورت نکالی جائے جس سے خریدنے والے کی استطاعت اور دولت کی تقسیم میں توازن پیدا ہو سکے تو سرمایہ داری نظام کی ناہمواریاں دُور ہو سکتی ہیں اور اس طرح اس کی جگہ ایک اس سے زائد معقول نظام لے سکتا ہے۔

سرمایہ داری نے سامراجی حکومت کی بنا ڈالی اور یہ اسی کا اثر ہے کہ جب سامراجی طاقتوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے نوآبادیوں کی تلاش کی تو آپس میں یہی بنائے مخاصمت پیدا ہوئی۔ ہر سامراجی حکومت کو نوآبادیوں کی ضرورت ہے کیونکہ یہی اس کے کارخانوں کے لئے جنس خام اور اس کی تیار کردہ اشیا کے لئے بازار مہیا کرتی ہیں۔ سامراجی طاقتوں کی نوآبادیوں کی قومیت سے روز بروز مخالفت زیادہ ہوتی جاتی ہے پیشہ ور مزدور

جن کی حق تلفی ہوئی ہے اُن کی زبردست تحریکوں سے آئے دن مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور معاشرتی اور تمدنی نزاع بھی بڑھتا جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ سیاسی اور اقتصادی معاملات میں گھڑی گھڑی نازک لمحات آجاتے ہیں جس کی وجہ سے نرخ اور محصول کے جھگڑے وسیع پیمانے پر برابر ہوتے رہتے ہیں اور ہر بار معاملہ کی نزاکت پیشتر کے مقابلے میں زیادہ بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ اب یہ نوبت پہونچی ہے کہ ہماری زندگی میں ایک مسلسل اُتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ ہر وقت یہی اندیشہ رہتا ہے کہ تار نہ ٹوٹ جائے اور جنگ کا خوفناک مغنی اپنا مہیب ساز نہ چھیڑ دے۔

تاہم یہ یاد رکھنا مناسب ہے کہ آج دنیا میں کھانے کی اور دیگر ضروریات کی چیزوں کی افراط ہے۔ آج کل کی ساری مصیبت محض اس وجہ سے ہے کہ موجودہ نظام ان کو تقسیم کرنے کا طریقہ نہیں جانتا۔ متعدد بین الاقوامی کانفرنسیں بھی یہ طریقہ دریافت نہ کر سکیں کیونکہ ان کے نمائندے بااختیار لوگوں کے حقوق کی پاسداری کرنے آئے تھے اور نظام میں کوئی تبدیلی تجویز کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ اقتصادی واقعات اور علمی ترقی اُس عمارت کی جو انہیں نے بنائی تھی بنیادیں ہلائے ڈال رہی ہے لیکن وہ ابھی اپنے اندھیرے کمروں میں بیٹھے اندھوں کی طرح ٹٹول رہے ہیں۔ ہر جگہ کے اہل خرد موجودہ نظام کی قطعی ناقابلیت تسلیم کرتے ہیں گو ان

خامیوں کو رفع کرنے کے لئے ان کی تجاویز مختلف ہیں۔ اشتراکیت اور پنچایتی راج کے حامی نہایت یقین کے ساتھ اشتراکیت کو اس مرض کا علاج سمجھتے ہیں اور ان کی تعداد روز افزوں ہے کیونکہ ان کا دعویٰ مدلل اور مضبوط ہے ۔ انجینروں کے ایک گروہ کا جسکو ٹکنوکریٹیز (Tochnoorats) کہتے ہیں۔ یہ خیال ہے کہ روپیہ کو دُنیا سے غائب کر دینا چاہیئے اور اس کی جگہ قوت کی اکائی کو دینی چاہیئے۔ اس تجویز نے امریکہ میں حال میں بڑی ہلچل مچادی ہے ۔ انگلستان میں میجر ڈگلس کی مدنی اعتبار کی تخئیل زیادہ مقبول ہوتی جاتی ہے ۔ اس تخئیل کی رو سے ملک کی دولت تمام باشندوں میں برابر سے تقسیم کردی جائے گی اور حصوں پر سب کو نفع تقسیم ہوگا ۔ قومی اور بین الاقوامی بازاروں میں تجارت کے بجائے تبادلہ رائج ہوگا ۔ ایسی انقلابی تجاویز کا خوش حال طبقے میں اور خصوصًا اہل دماغ اور اہل خرد میں تذکرہ ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ دنیا کی ذہنیت میں کتنی زبردست تبدیلی پیدا ہو رہی ہے ۔ ہم لوگوں میں سے کتنے آدمی اس بات کو ذہن میں لا سکتے ہیں کہ دنیا میں روپیہ نہ ہو اور اُس کے بجائے قوت کی اکائی سے قیمت کا اندازہ کیا جائے ۔ اور پھر بھی اس تجویز کو کوئی غیر ذمہ دار اور مشتعل مزاج شورش برپا کرنے والے پیش نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس کی وکالت نہایت متانت اور جوشِ خلوص کے ساتھ مشہور و معروف اقتصادی ماہرین کر رہے ہیں ۔

یہ تو دنیاوی پس منظر ہے۔

ایشیائی پس منظر بھی اس سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے لیکن اس کی اپنی خصوصیات بھی ہیں۔ قومیت اور سامراجی طاقت کی جنگ کے لئے ایشیا ہی خاص رزمگاہ ہے۔ یورپ اور شمالی امریکہ کے کھلے ہوئے پھولوں کے مقابلے میں ایشیا ابھی تک ناشگفتہ غنچہ کی مانند ہے۔ اس کی آبادی کثیر ہے اور اگر اسے خریدنے کی استطاعت ہو تو یہ کثیر تعداد میں اشیا کو استعمال کر سکتا ہے۔ سامراجی طاقتیں جو کہ بہت عاجز آگئیں ہیں اور جو اپنی اقتصادی کشادگی کے لئے گھبرا گھبرا کر چاروں طرف نظر ڈالتی ہیں ان کو اب بھی باوجود قومیت کی رکاوٹوں کے ایشیا میں بہت گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے مغرب اپنا فالتو مال نکالنے کے لئے ایشیا پر ہمیشہ نظر ڈالتا ہے اور اس طرح چاہتا ہے کہ اُس کا نظام سرمایہ داری کچھ دنوں کے لئے اور مستحکم ہو جائے۔ مشرق میں سرمایہ داری ابھی کم عمر ہے یہ پورے طور پر جاگیردارانہ نظام تک پر قابو نہیں پا سکی ہے۔ اور اس کے برسرِ اقتدار ہونے کے پیشتر ہی بہت سی طاقتیں اس کے مقابلے پر آمادہ ہو گئی ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ نظام سرمایہ داری اگر یورپ اور امریکہ میں ٹوٹ گیا تو ایشیا میں بھی جانبر نہ ہو سکے گا۔

قوم پرستی ایشیا میں اب بھی سب سے زبردست طاقت ہے (ہم

اس وقت ایشیائی روس کو نظر انداز کر سکتے ہیں) یہ تو قدرتی بات ہے کہ جس ملک میں غیر ملکی حکومت ہوگی اس کے دل میں قومیت کا جذبہ پہلے پیدا ہوگا لیکن وہ زبردست اقتصادی طاقتیں جو آج دنیا کی صورت تبدیل کئے دے رہی ہیں وہ رفتہ رفتہ اس قومیت پر اپنا رنگ جماتی جاتی ہیں اور ہر جگہ اس کو اشتراکیت کا لباس پہنا کر پیش کرتی ہیں۔ سیاسی آزادی کے لئے قومی لڑائی رفتہ رفتہ اقتصادی آزادی کے لئے معاشرتی جنگ میں تبدیل ہو رہی ہے۔ خود مختاری اور مشترکہ حکومت ہمارے نصب العین بن رہے ہیں۔ کوئی ایک پر زور دیتا ہے اور کوئی دوسرے پر لیکن یہ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں جتنی ہی کہ سیاسی آزادی میں دیر ہوتی جاتی ہے اتنا ہی تصویر کا دوسرا رخ زیادہ جاذب نظر ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ اب خاص طور پر دنیا کی حالت دیکھتے ہوئے۔ یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا کے کم سے کم چند ممالک کو سیاسی اور تمدنی آزادی ساتھ ہی ساتھ ملے گی۔

یہ ایشیائی پس منظر ہے۔

دیگر ایشیائی نوآبادیوں کی طرح ہندوستان میں بھی پرانی قومی ذہنیت اور نئی اقتصادی ذہنیت میں آج ایک جنگ ہوتی نظر آتی ہے۔ ہم میں سے اکثر نے قوم پرستی کی آب و ہوا میں آنکھیں کھولی ہیں اور پرورش پائی ہے اور ہمارے دماغ اور خیال کا جو رجحان زندگی بھر کی عادت سے پڑ چکا ہے

اس کا چھوڑنا بہت مشکل ہے۔ پھر بھی ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا نظریہ ناقص ہے کیونکہ یہ دنیا اور ملک کی موجودہ حالتوں سے مناسبت نہیں رکھتا۔ دونوں کے درمیان میں ایک کھائی نظر آتی ہے۔ ہم اس کو پار کرنا چاہتے ہیں لیکن ایک نئی ذہنیت پیدا کرنے میں ہمیشہ خونِ جگر پینا پڑتا ہے ہم میں سے بہت لوگ آج اسی وجہ سے پریشان اور پراگندہ مزاج ہیں۔ لیکن اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ ایک کنارے پر بند پانی میں پڑے رہ جائیں جہاں ان کشتیوں کی گندگی آکر جمع ہوتی ہے جو ترقی کی دھارا پر بڑھتی چلی جارہی ہیں تو ہمیں کسی نہ کسی طرح اسے پار تو کرنا ہی پڑے گا۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جب انیسویں صدی بیسوی صدی کے معاملات حل نہیں کرسکتی تو ساتویں صدی یا اور پرانے زمانے کی ذہنیت کیسے کوئی مناسب تصفیہ سوچ سکتی ہے۔

دنیاوی اور ایشیائی پس منظر پر نظر ڈالنے کے بعد ہم اپنے قومی مسئلے کو زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کا ہم سے اتنا قریبی رشتہ ہے کہ ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ محض ہمارے لئے مخصوص ہے اور دنیاوی معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کا مسئلہ ایشیائی مسئلے کا ایک جزو ہے اور ایشیائی مسئلہ دنیاوی معاملات کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہم اگر چاہیں بھی تو اس کو جدا نہیں کرسکتے۔

جو کچھ ہندوستان میں ہوگا اس کا اثر دنیا لے گی اور دنیا کے واقعات ہندوستان کے مستقبل پر اثر ڈالیں گے۔ دراصل آج دنیا کے سامنے یہی تین بڑے مسائل ہیں۔ نظام سرمایہ داری کی قسمت کا فیصلہ جو حقیقتاً یورپ اور امریکہ کی قیمت کا فیصلہ ہے۔ ہندوستان کا مستقبل اور چین کا مستقبل اور یہ تینوں ایک دوسرے سے ہم رشتہ ہیں۔

ہندوستان کی لڑائی اس بڑی لڑائی کا ایک جزو ہے جو روئے زمین پر ہر جگہ مجبور اور بیکس اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ دراصل یہ ایک اقتصادی جنگ ہے جس کو لڑنے کے لئے بھوک اور ناداری غریبوں کو مجبور کر رہی ہے حالانکہ یہ قومیت کی پوشاک پہن کر سامنے آتی ہے۔

ہندوستانی آزادی اس لئے ضروری ہے کہ جو بار ہندوستانی جنتا پر اور درمیانی طبقہ پر ہے وہ ناقابل برداشت ہے اور یہ فوراً کم یا دُور ہونا چاہئے۔ جتنا ہی یہ بوجھ کم ہوگا اُتنی ہی آزادی حاصل ہوگی۔ یہ بوجھ زیادہ تر تو ایک پردیسی حکومت کے مقررہ حقوق کی وجہ سے ہے اور کچھ چند ہندوستانی اور غیر ملکی گروہوں کی اغراض کے سبب سے۔ اس طرح آزادی حاصل کرنا جیسا کہ گاندھی جی نے حال ہی میں کہا "حاصل شدہ حقوق کے زائل کرنے کا دوسرا نام ہے"۔ اگر کوئی دیسی حکومت پردیسی حکومت کی جگہ لے لے لیکن ان حقوق کو بدستور قائم رکھے تو اس میں

آزادی کا شائبہ بھی نہ ہوگا۔

ہمارے دماغوں کو یہ عجیب عادت پڑ گئی ہے کہ ہم آزادی کو کاغذی ضابطوں کے الفاظ میں تلاش کرتے ہیں۔ اس وکیلانہ ذہنیت سے زیادہ مہمل کوئی چیز نہیں جو واقعاتِ زندگی کو بھول کر اور اقتصادی مسائل کو پسِ پشت ڈال کر محض قانونی الفاظ اور نظائر میں الجھی ہوئی ہے۔ وکیلوں کی عقل ماضی پر نظر ڈالتے ڈالتے گُدّی میں آگئی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں سامنے دیکھنے کی قابلیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ لنج اور اپاہج بھی آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہیں۔ لیکن وکیل ایک کٹر مذہب پرست کی طرح پیچھے ہی کی طرف قدم ڈالتا ہے کیونکہ دونوں کے نزدیک حقیقت صرف ماضی کے پردوں میں پوشیدہ ہے۔

گول میز کی تجاویز آج قریب قریب اتنی ہی مُردہ ہیں جتنی کہ نورجہاں بیگم۔ اور یہ کسی توجہ کی مستحق نہیں۔ اس کی کبھی نیت ہی نہ تھی کہ ہندوستانیوں کو نام کو بھی آزادی دے۔ اس کا تو صرف منشا یہ تھا کہ چند ہندوستانی اہل غرض برطانیہ کی طرف ہو جائیں اور اس میں یہ کامیاب ہوئی۔ اس نے اس سوال کا جواب جو میں نے اس مضمون کے شروع میں پیش کیا تھا یعنی ہم کس کی آزادی کے لیے کوشاں ہیں، اپنے بھگتوں کو نہایت اطمینان بخش اور میٹھے الفاظ میں دیا۔ اس نے برطانوی حقوق

اور زیادہ وسیع کئے اور ان کی حفاظت اور پاسداری کا پورا وعدہ کیا۔ جیسا کہ وٹھل بھائی پٹیل نے کہا اس نے ہوم رول تو دیا مگر وائسرائے کو۔ اس نے برطانوی سرمایہ داری کی بنیادیں اور زیادہ مستحکم کر دیں اور برطانوی اہلکاروں کو بعض صورتوں میں تو پہلے سے بھی زیادہ انعام بخشا۔ غیر ملکی فوج کے قبضے کو دائمی بنانے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ اس نے والیانِ ریاست اور بڑے بڑے اہلِ دول کے جاگیردارانہ حقوق کو اور زیادہ اہمیت دی اور ان کے اختیارات وسیع کئے۔

غرضکہ مختصراً یہ تجویز اُن اہل غرض کی حفاظت اور پائداری کے لئے تھی جو ہندوستانی جنتا کے حقوق مارے بیٹھے ہیں اور اُن کا خون چوس رہے ہیں۔ یہ کارآمد محنت کرنے کے بعد جو کہ ان کے لئے مخصوص طور پر مفید تھی اس تجویز کے پیش کرنے والوں نے ہم کو یہ بتایا کہ ہر صوبہ کو خود انتظامی قائم کرنے میں لاکھوں روپیہ خرچ ہوگا۔ اس طرح محض یہی نہیں ہوا کہ عوام پر پُرانے بار بدستور قائم رہے بلکہ کچھ نئے بوجھوں کا اور اضافہ کر دیا گیا۔ یہ وہ ذہانت کا فیصلہ تھا جو گول میز کانفرنس کے شرکا نے اپنی ذکاوت اور تیز فہمی سے دریافت کیا۔ وہ اپنے اپنے گروہ کے حقوق کی پاسداری میں اتنے محو تھے کہ وہ صرف ۳۵ کروڑ کی ہندوستانی جنتا کو اتفاق سے بھول گئے۔

اس ضابطہ کی حماقت وہ بچہ بھی بتا سکتا ہے جس نے سیاست میں

آج ہی قدم رکھا ہو۔ قومی تحریک کی ساری بنا محض اقتصادی ترقی کی خواہش پر ہے۔ اور اس کی ساری طاقت اور سارا جوش محض اس جذبہ سے حاصل ہوتا ہے جو بیکس اور مجبور جنتا کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہے اور اُن کے حقوق ان کو دلانا چاہتا ہے۔ اگر یہ سختیاں قائم رہیں بلکہ اور بڑھیں تو یہ ایک معمولی دماغ والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ لڑائی محض جاری ہی نہیں رہے گی بلکہ اور شدید ہو جائے گی۔ افسران اور افراد چاہے رہیں یا جائیں۔ چاہے تھک جائیں یا اُن کا دل اُچاٹ ہو جائے۔ چاہے صلح کر لیں یا دشمن سے مل جائیں لیکن جو مصیبت کی ماری جنتا ہے وہ تو برابر لڑے ہی جائے گی کیونکہ اس کے اصل افسر تو بھوک اور ناداری ہیں جو اسے مار مار کر لڑنے پر مجبور کرتے ہیں۔ سوراج یا آزادی اس کے لئے ایک حسین کاغذی چیز نہیں ہے اور نہ کوئی ایسا سوال جس پر آئندہ غور کرنا ہے۔ اُس کے لئے تو یہ آج اور ابھی کا سوال ہے اور اس کو فوری تسکین درکار ہے۔ ہرن کا کباب کھانے والے کے لئے تو یقیناً لذیذ ہوتا ہے لیکن بیچارے ہرن کو وہ تمام حسین دلیلیں قائل نہیں کر سکتیں جو قربانی کی عظمتوں کا احساس دلاتی ہیں۔ اور نہ کھانے والے کے سامنے سجا کر پیش کئے جانے پر اس کی تشفی ہو سکتی ہے۔

لہذا ہندوستان کی پہلی منزل وہی ہو سکتی ہے جہاں جنتا پر زبردستی

کرنے کی کوئی گنجائش نہ ہو اور ان کو ستانا بند کر دیا جائے۔ سیاسی زبان میں اس کے معنے خود مختاری اور برطانیہ یعنی سامراجی حکومت سے قطع تعلق کرنے کے ہوں گے۔ اقتصادی اور معاشرتی طور پر اس کا نتیجہ مقررہ حقوق یا مخصوص گروہوں کے مخصوص اختیارات کا زائل کرنا ہوگا۔ دنیا اسی بات کے لئے لڑ رہی ہے اور اس طرح آزادیِ ہندوستان کی لڑائی بھی دنیا کی لڑائی کا ایک جزو بن جاتی ہے۔ ہمارا منشار مفادِ عام ہے یا ناز و نعم کے پالے ہوئے اہلِ غرض کے مخصوص حقوق کی پاسداری! ہم میں سے ہر ایک کو اس سوال کا جواب صاف الفاظ میں بغیر گول گول باتیں کئے ہوئے دینا ہوگا۔ جہاں قوموں کی قسمت اور کروڑوں انسانوں کی زندگی کا مسئلہ درپیش ہے وہاں دو رُخی باتیں کرنے کی گنجائش نہیں۔

جب سے کہ عوام نے سیاست میں قدم رکھا ہے، محلوں میں سازش کرنے اور آراستہ کمروں میں بیٹھ کر سیاسی معاہدے اور تصفیہ کرنے کا زمانہ گزر گیا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کو دربارشاہی کی تہذیب نہیں آتی۔ ہم نے ان کو تہذیب سکھانے کی تکلیف ہی کب اٹھائی۔ انھوں نے صرف واقعات کے مدرسہ میں تعلیم پائی ہے اور مصیبت ان کی مدرس رہی ہے۔ انھوں نے اپنی سیاست ان بڑی تحریکوں سے حاصل کی ہے جن میں افراد کا اور گروہوں کا سچا کردار نظر آجاتا ہے۔ قانون شکنی کی تحریک نے جو

ہندوستانی جنتا کو سبق دیا ہے اس کو وہ کبھی نہیں بھول سکتی۔

خودمختاری کے لفظ کو اس بُری طرح سے استعمال کیا گیا ہے کہ یہ ہمارے مقصد کی صحیح طور پر ترجمانی نہیں کرتا لیکن اس کے علاوہ کوئی دوسرا موزوں لفظ بھی نہیں ہے اور چونکہ ہم کو اس سے بہتر لفظ نہیں ملتا اس لئے اسی کو استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ قومی علیحدگی آج کل کی دنیا میں جو روز بروز سمٹتی جاتی ہے اور ایک ہوتی جاتی ہے نہ تو ممکن ہے اور نہ مناسب ہے۔ قومی اور بین الاقوامی تحریکیں آج کل دنیا پر چھائی ہوئی ہیں اور قوموں کا ایک دوسرے پر دارومدار روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ ہمارا مقصد اور نظریہ بھی تاریخی رجحان کے خلاف نہیں رہ سکتا اور ہم کو بھی دنیاوی تعاون اور سچی بین الاقوامیت کے حق میں اپنی قومی تنگ نظری کو خیرباد کہنے کے لئے تیار ہوجانا چاہیے۔ اس لئے خودمختاری کے معنے ہمارے لئے علیحدگی اختیار کرنے کے نہیں ہیں بلکہ سامراجی قابو سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ اور چونکہ یہ سامراجی طاقت آج ہندوستان میں برطانیہ کے روپ میں ہے لہذا ہم کو آزادی برطانیہ سے علیحدہ ہوکر ہی مل سکتی ہے۔ ہمارا برطانوی جنتا سے کوئی جھگڑا نہیں لیکن برطانوی سامراج میں اور ہندوستانی قوم پرستی میں کوئی مراعات کی گنجائش نہیں اور نہ اس میں کبھی صلح ہوسکتی ہے۔ اگر برطانیہ کے دماغ سے سامراجی کی بو نکل جائے تو ہم بڑی خوشی سے

بین الاقوامی معاملات میں اُس سے تعاون کریں گے۔ ورنہ نہیں۔

لیبر اور لبرل فریق کے برطانوی مدبر ہم کو اکثر قومی تنگ نظری کی خرابیاں دکھلاتے ہیں۔ اور برطانوی شہنشاہیت کی خوبیوں کا جس کو کہ اس مبالغہ آمیز زبان میں "برطانوی قوموں کی دولتِ عام" کہنے لگے ہیں تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ خوشنما الفاظ اور دل آویز جملوں کی چادر میں سامراجی حکومت کی وحشیانہ اور مہیب شکل کو چھپا دینا چاہتے ہیں اور ان کی یہی کوشش ہے کہ ہم اس کی جان لینے والی آغوش میں سوتے رہیں۔ کچھ ہندوستانی بھی جنھوں نے قومی خدمت کی ہے (اور جن کو یہ بات سمجھنا چاہیئے) بین الاقوامیت کی خوبیاں جس سے وہ برطانوی شہنشاہیت مراد لیتے ہیں سراہتے ہیں۔ اور اُس نادر چیز یعنی ڈومنین اسٹیٹس کے بجائے (جس کے دینے کا کسی نے کبھی جھوٹوں وعدہ بھی نہیں کیا) مکمل آزادی طلب کرنے پر ہماری تنگ خیالی کا اکثر گلہ کرتے ہیں۔ یہ سب جانتے ہیں کہ اہل برطانیہ کو یہ خاص قابلیت حاصل ہے کہ وہ اپنے اخلاقی طبائع کو اپنی ذاتی منفعت کے سانچے میں ڈھال لیں۔ یہ تو شاید غیر فطری نہیں لیکن حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ ہمارے ہموطن کس طرح ایسی چکنی چپڑی باتوں میں آجاتے ہیں۔ جو لوگ کہ اپنی آنکھیں بند رکھتے ہیں ان کو تو آفتاب کی روشنی میں بھی کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ بات مگر قابل غور ہے کہ بیرونی معاملات میں جو

طرز عمل انگلستان کا رہا ہے اس نے بین الاقوامی تعاون کے راستہ میں چاہے وہ لیگ اوینیشن کے یا اس کے علاوہ کسی اور ذریعے سے تجویز کیا گیا ہو سب میں زیادہ روڑے اٹکائے ہیں تمام یورپ اور امریکہ کے لوگ اسے جانتے ہیں لیکن چونکہ ہم میں سے زیادہ تر غیر ملکی سیاسیات پر انگریزی آنکھوں سے نظر ڈالتے ہیں۔ لہذا وہ ابھی اس بات کی تہ تک نہیں پہونچے ہیں۔ انسداد اصلحہ سازی۔ ہوا سے بمبازی۔ منچوریا کی حکومت کا سوال۔ ان تینوں معاملوں میں جو انداز کہ انگلستان نے اختیار کیا وہ اس دعوے کا ثبوت ہیں۔ کیلاگ اور بریان کا پیرس والا عہدنامہ جس میں جنگ کا ارتداد کیا گیا تھا وہ بھی جب تک کہ اپنی شہنشاہی مملکت کے متعلق کچھ ایسی شرطیں بڑھوا نہ لیں جن سے اس عہدنامہ کا اثر زائل ہو گیا انگلستان نے منظور نہیں کیا۔ برطانوی شہنشاہیت اور بین الاقوامیت میں قطبین کا فرق ہے اور اس شہنشاہیت میں رہ کر ہم کبھی بین الاقوامیت حاصل نہیں کر سکتے۔

اصل سوال جو اس وقت ہمارے سامنے بلکہ ساری دنیا کے سامنے ہے وہ نظام حکومت میں سیاسی۔ اقتصادی اور تمدنی اعتبار سے بنیادی تبدیلیاں پیدا کرنا ہے۔ صرف اسی طرح ہم ہندوستان کو ترقی کے راستہ پر لا کر کھڑا کر سکتے ہیں اور اس کی روز افزوں تباہی کا انسداد کر سکتے ہیں۔ ایسے انقلابی زمانے میں جیسا کہ آج کل دنیا میں ہے موجودہ نظام کو

چلانے کا خیال دل میں لانا اور اس نیت سے اس کو بہتر بنانے کی کوشش کرنا محض خیال خام ہی نہیں ہے بلکہ اپنی قوت کا ضائع کرنا ہے۔ ایسا کرنا اُس موقع کو بھی ہاتھ سے کھونا ہے جو زندگی میں گھڑی گھڑی نہیں آتا اور جو تاریخ عرصہ دراز کے بعد صرف ایک بار دیتی ہے۔ بقول مسولینی (Mussolini) کے "آج ساری دنیا انقلاب میں ہے اور واقعات ہم کو ایسی زبردست طاقت سے ڈھکیل رہے ہیں کہ یہی معلوم ہوتا ہے جیسے کہ کوئی ثابت قدم نیت پسِ پردہ برسرِ کار ہے" افراد چاہے وہ کتنے ہی بلند مرتبہ کیوں نہ ہوں جب دنیا خود حرکت میں آتی ہے تو اس تبدیلی میں ان کا حصہ بہت تھوڑا سا رہ جاتا ہے۔ کہیں کہیں پر کسی حد تک وہ دھارے کا رُخ تبدیل کر سکتے ہیں لیکن اُمنڈتی ہوئی موجوں کو روک نہیں سکتے۔ لہٰذا دنیا کو سکون نصیب ہونا اتفاقاتِ زمانہ کے ہاتھ ہے اور انسانی طاقت سے باہر ہے۔

ہندوستان کدھر جا رہا ہے۔ یقیناً اس عظیم الشان انسانی مقصد کی طرف جہاں معاشرتی اور اقتصادی ہمواری کا رواج ہوگا۔ جہاں ایک ملک دوسرے ملک پر، جہاں ایک گروہ دوسرے گروہ پر زبردستی نہ کر سکے گا۔ جہاں تمام دنیا کے ممالک کا ایک متحدہ معاشرتی نظام ہوگا اور بین الاقوامی تعاون کے چوکھٹے میں جڑی ہوئی قومی آزادی کی تصویر نظر آئے گی۔

جیسا کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں یہ محض خواب وخیال نہیں ہے۔ امروز اور مستقبل قریب کی عملی سیاسیات میں اس کی جھلک موجود ہے۔ ہم ممکن ہے کہ آج اس سے اپنی آنکھیں روشن نہ کر سکیں لیکن جن لوگوں کی نظریں دھندلی نہیں ہیں وہ اس درخشاں آفتاب کو اُفق پر نکلتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ اور اگر ہم کو منزل مقصود تک پہونچنے میں کچھ دیر بھی لگے تو بھی ہمیں اس کا کوئی غم نہیں۔ جب تک کہ ہمارے قدم صحیح راستے پر پڑیں اور ہماری نگاہیں برابر سامنے کی طرف رہیں۔ کیونکہ کسی بلند مقصد کو حاصل کرنے کے لئے قدم بڑھانا خود اپنی جگہ پر ایک خوشی اور راحت ہے، اور ایک حد تک کامیابی بھی۔ بقول برنارڈ شا (Bernard Shaw) "دُنیا کی سچی خوشی یہی ہے کہ کسی ایسے مقصد میں جو بلند ہو، کام آنا۔ اور پیشتر اس کے کہ جنس ناکارہ کی طرح گھورے پر پھینکے جانے کی نوبت آئے اپنے دل و دماغ کی ساری قوتیں صرف کرکے بالکل شل اور چور ہو جانا۔ اور بجائے ایک مجموعۂ آلام و مصائب بن کر چڑچڑے پن اور خود غرضی سے دنیا کی عدم توجہی کی شکایت کرنے کے خود قدرت کی ایک طاقت بن جانا۔"

سر محمد اقبال کے سوالوں کا جواب

میں نے سر محمد اقبال کا بیان جو انھوں نے اخباروں میں اشاعت کے لئے بھیجا ہے بڑے غور سے پڑھا۔ انھوں نے نہایت صاف گوئی اور خوش اخلاقی سے کام لیا ہے اور مجھ سے اپنے سوالات کا جواب مانگا ہے۔ میں بڑی خوشی سے ان کی دعوت قبول کرتا ہوں۔ لیکن پہلے میں دوسری گول میز کانفرنس کے اُس واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کی طرف سر محمد نے اشارہ کیا ہے اور جو فرقہ وارانہ مصالحت کی گفتگو کے سلسلے میں پیش آیا تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر کچھ کہنے کا حق نہیں رکھتا ہوں۔ لیکن جو لوگ اس واقعے کو مجھ سے زیادہ اچھی طور سے جانتے ہیں وہ اُن غلط فہمیوں کو جو ممکن ہے کہ آپس میں پیدا ہوگئی ہوں ضرور رفع کردیں گے۔ اور جب سر محمد اقبال گاندھی جی کی کسی شرط کو خلاف انسانیت قرار دیتے ہیں تو مجھے پورا یقین ہے کہ ان کو کوئی زبردست غلط فہمی ہوئی ہے۔

سر محمد فرماتے ہیں کہ گاندھی جی ذاتی حیثیت سے گول میز کانفرنس کے مسلمان نمائندوں کے مطالبات ماننے کے لئے تیار تھے لیکن وہ یہ وعدہ نہیں کرتے تھے کہ کانگریس بھی ان مطالبات کو تسلیم کرلے گی۔ مجھے تو یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ گاندھی جی یا اُن کی جگہ کوئی اور شخص اس کے علاوہ کوئی دوسرا طرزِ عمل اختیار نہیں کرسکتا تھا۔ کم سے کم کسی جمہوری انجمن کا کوئی نمائندہ اس کے خلاف ہرگز نہیں کرسکتا تھا۔ کانگریس کی مجلس انتظامیہ بھی کانگریس کی تجاویز کو رد نہیں کرسکتی۔ وہ ایسا مسئلہ یا تو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے پیش کرسکتی ہے یا کانگریس کے اجلاس عام میں پھر سے اُٹھا سکتی ہے جس کا فیصلہ ناطق ہوسکتا ہے۔ کانگریس کے عام رجحان کے علاوہ یہ بھی بخوبی معلوم تھا کہ خود ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک کافی بڑی جماعت خصوصاً قوم پرست مسلمان ان میں سے چند مطالبات کے خلاف تھے۔

گاندھی جی انگلستان جانے سے پہلے بار بار کہہ چکے تھے کہ وہ اس مسئلہ پر ڈاکٹر انصاری کے فیصلے کو مسلم قوم پرستوں کی رائے تسلیم کریں گے۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر مسلمانوں کی دونوں جماعتیں آپس میں کوئی تصفیہ کرلیں گی تو وہ فوراً بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اُسے قبول کرلیں گے۔ انھوں نے اسی لئے کہ ایسا تصفیہ ہونے میں آسانی ہو گھڑی گھڑی اس بات پر زور دیا کہ ڈاکٹر انصاری گول میز کانفرنس میں بطور ڈیلیگیٹ کے بلائے جائیں لیکن

مسلمان نمائندوں سے ہمیشہ شد و مد سے اس کی مخالفت کی۔ باوجود ان سب باتوں کے آخرکار سمجھوتے کی کوئی صورت نکالنے کے لئے گاندھی جی نے یہاں تک کیا کہ اپنے آپ کو ذاتی طور پر پابند کرلیا۔ حالانکہ وہ کانگریس کو پابند نہیں کرسکتے تھے پھر بھی یہ ظاہر ہے کہ ان کی رائے اور وکالت کانگریس کا مزاج تبدیل کرنے میں کتنی زبردست طاقت ہوتی۔

دوسری شرط، جو کہا جاتا ہے کہ گاندھی جی نے کی وہ یہ تھی کہ مسلم نمائندے اچھوتوں کے مخصوص مطالبات کی تائید نہ کریں۔ اسی کو سر محمد خلاف انسانیت قرار دیتے ہیں کیونکہ اس کے معنے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح اچھوتوں کو ہمیشہ مجبور اور پامال رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ بڑا عجیب وغریب نتیجہ انھوں نے اخذ کیا ہے۔ اگر گاندھی جی کو دل سے کسی بات کی لگی ہے تو وہ یہی ہے کہ اچھوت اچھوت نہ رہیں۔ ان کے حقوق یا اختیارات زائل نہ کئے جائیں۔ ان پر کسی قسم کی رُکاوٹیں یا بندشیں نہ رکھی جائیں اور وہ دوسری جماعتوں کے مدِمقابل سمجھے جائیں۔ وہ تو اس کے مخالف محض اس وجہ سے تھے کیونکہ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اگر اچھوتوں کی علیحدہ ایک جماعت قائم کی جائے گی تو وہ ہمیشہ کے لئے داغی ہوجائیں گے اور ان کا دوسری جماعتوں میں ملنا قریب قریب ناممکن ہوجائے گا۔ یہ بات تو سب کو بخوبی معلوم ہے کہ دوسری گول میز کانفرنس کے دوران میں کچھ اقلیتوں کے نمائندوں اور

کنزرویٹوز (Conservatives) میں ایک طرح کا اتحاد قائم کیا گیا تھا۔ گاندھی جی اسی واسطے مسلم نمائندوں سے یہ چاہتے تھے کہ وہ اچھوتوں کی علیحدہ جماعت بنائے جانے کی تائید نہ کریں۔ جہاں تک مجھے علم ہے انھوں نے اچھوتوں کی مخصوص یا مزید نمائندگی کے خلاف اپنی آواز کبھی بلند نہیں کی۔ برخلاف اس کے ان کی تو یہ رائے ہے کہ ان کو ہر امکانی مدد دی جانی چاہئے تاکہ وہ دیگر ترقی یافتہ گروہوں یا قوموں کے ہمدوش آسکیں۔ بعد کے واقعات نے یہ دکھا دیا ہے کہ وہ اس راستہ میں کہاں تک قدم بڑھانے کو تیار ہیں۔ باوجود اس کے کہ میں اشتراکیت کا دلدادہ ہوں مجھے ان کی دلیلوں میں کوئی نقص یا خامی نظر نہیں آئی۔

سر محمد کو گاندھی جی کے اس طرزِ عمل پر غالباً شک ہوتا ہے کہ اس میں بھی کوئی دغابازی کی چال ہے۔ وہ یہ اشارہ کرتے ہیں کہ گاندھی کو اچھوت اودھار کی اتنی فکر نہیں ہے بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ اچھوت اور جماعتوں سے خصوصاً مسلمانوں سے (یہ میرا خیال ہے) مل نہ سکیں۔ کسی بلاوجہ شک کا مٹانا یا خواہ مخواہ کی بدظنی دور کرنا بہت مشکل بات ہے لیکن جو شخص کہ گاندھی جی کو تھوڑا بہت بھی جانتا ہے وہ بھی اس خیال کو کہ وہ ہریجنوں کی خدمت سیاسی اغراض سے کر رہے ہیں مہمل قرار دے گا۔ ذاتی طور پر مجھے ان مذہبی سرناموں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ بہت جلد

مٹ جائیں گے یا کم از کم ان کی کوئی سیاسی وقعت باقی نہ رہے گی۔ سر محمد غالباً ابھی تک اُنھیں سیاسی اہمیت دیتے ہیں۔ گاندھی جی جہاں تک مجھے علم ہے ایسا نہیں کرتے لیکن وہ صاحب ایمان ضرور ہیں اور وہ ہندو دھرم کی بنیادی باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ انھیں بنیادی باتوں کو رائج کرنا چاہتے ہیں اور اُن غیر ضروری چیزوں کو جو ان میں شامل ہوگئی ہیں یک قلم مٹا دینا چاہتے ہیں۔ وہ چونکہ کسی فرقہ کے اچھوت قرار دئے جانے کو اسی قسم کا ذلیل اور قابل نفرت اضافہ سمجھتے ہیں لہٰذا وہ اس کی بیخکنی پر آمادہ ہیں۔ یہ کہنا تو بالکل غلط ہے کہ وہ اچھوتوں کا اونچی ذات والے ہندوؤں میں ملجانا نہیں چاہتے۔ یوں تو وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی ساری قومیں آپس میں گھُل مل جائیں لیکن سر محمد کی طرح وہ بھی تہذیب کے چند بنیادی اصولوں کے دلدادہ ہیں جن کو وہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ دوسری تہذیبوں کو بھی مکمل آزادی دینا چاہتے ہیں۔

میرا ذاتی نظریہ مختلف ہے۔ اس پر مذہب کا رنگ نہیں چڑھا ہے اور میرے لئے مذہبی اعتبار سے مختلف جماعتوں پر نظر ڈالنا بہت دشوار ہے لیکن سر محمد کا غالباً یہی نظریہ ہے اور وہ خیال کے موجودہ رجحانات کی طرف سے اپنی نگاہیں پورے طور پر پھیرے ہوئے ہیں۔ مجھے یہ بھی اندیشہ ہے کہ وہ مذہب میں نسل اور تہذیب کا سوال بھی لے آتے ہیں۔ شاید

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے دعوے کی تائید میں علم الحیات کی رو سے ایک دلیل پیش کی جس کو میں مطلق سمجھ نہ سکا۔ گاندھی جی کو ایک طرف تو اُن فرضی کوششوں پر جو انھوں نے اچھوتوں کو دوسری قوموں سے ملنے سے روکنے کے لئے کیں گنہگار قرار دیا۔ اور دوسری طرف خود اپنی رائے یہ دی کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کا گھُل مِل جانا محض خواب وخیال ہے اور اس کا جلد سے جلد دماغ سے نکال دینا ہی بہتر ہے۔

آیا علم الحیات کی رو سے ہندوستان کی مختلف جماعتیں آپس میں گھُل مِل سکیں گی یا نہیں۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس میں بہت سی تنقیحیں پیدا ہوتی ہیں جو علم نسلیات (Eugenics) یا تہذیب کی نظر کے لئے مخصوص طور پر قابل توجہ ہو سکتی ہیں۔ یہ دراصل کوئی سیاسی امر نہیں ہے اور موجودہ زمانے والے اس میں محض برائے بحث دلچسپی لے سکتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ اس طرح شیر وشکر ہونا ہمارے لئے لازمی ہے لیکن میں یہ نہیں بتا سکتا کہ کب تک ایسی صورت رونما ہوگی۔

لیکن اس مسئلہ کا فرقہ وارانہ سوال سے کیا تعلق ہے؟ کیا مسلمانوں، سکھوں یا ہندوستانی عیسائیوں کے مذہبی گروہوں میں اور ہندوؤں کی جماعت میں علم الحیات کی رو سے کوئی فرق ہے؟ کیا ہم مختلف اقسام کے جانور ہیں یا ایک ہی قسم کے مختلف نمونے؟ نسل اور تہذیب کے اختلافات تو

ہیں، لیکن ان کا مذہبی تفریق سے کوئی واسطہ نہیں - بلکہ یہ اختلافات تو مذہبی حدود کو بیچ سے توڑتے ہوئے نکل جاتے ہیں - اگر کوئی شخص اپنا مذہب تبدیل کرلے تو نہ تو اس کی نسلی خصوصیات میں فرق آتا ہے نہ اُس کی حیوانی ساخت پر اثر پڑتا ہے اور نہ اس کی تہذیب کا پسِ منظر کافی طور پر مٹا یا جا سکتا ہے - تہذیب قومیت سے اثر پذیر ہوتی ہے نہ کہ مذہب سے - اور موجودہ کیفیات زمانہ تو ایک ایسا طبقہ پیدا کر رہی ہیں جس کی تہذیب کو بین الاقوامی کہا جا سکتا ہے - گذشتہ زمانے میں بھی مختلف تہذیبوں نے ایک دوسرے پر اثر ڈالا ہے اور مشترک تہذیبوں کی بھی بنیاد ڈالی ہے لیکن عام طور پر اخلاق و عادات پر قومی رنگ غالب رہا ہے - اُن ممالک میں جہاں اپنی ذاتی پُرانی تہذیب موجود تھی ایسا ضرور ہوا چنانچہ ہندوستان - ایران اور چین اسی کی مثالیں ہیں -

اسلامی تہذیب آخر کیا چیز ہے ؟ کیا اس سے قبیلہ شم کی عربی تہذیب مراد لی جائے ، یا قوم آریہ کی ایرانی تہذیب سمجھی جائے ، یا دونوں کا مجموعہ ؟ عربی تہذیب تو ایک شاندار دور کے بعد نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے لیکن اپنے کامیاب ترین عہد میں بھی ایرانی تہذیب سے متاثر رہی ہے - ہندوستان میں تو اس کا شاید ہی کوئی نشان ہو - ایرانی تہذیب تو درحقیقت تبلیغ اسلام سے بہت پیشتر کی ہے اور اس پُرانی ایرانی تہذیب اور

رسم کا ہزار ہا سال تک قائم رہنا تاریخ کا ایک بہت عجیب و غریب سبق ہے۔ آج بھی ایران اپنی تہذیب کے نقوش تازہ کرنے کے لئے اُسی پُرانے زمانے کی طرف نگاہیں ڈال رہا ہے۔ اسی ایرانی تہذیب نے یقیناً ہندوستان پر اثر ڈالا اور خود بھی اثر پذیر ہوئی۔ لیکن حدود ہندوستان میں تو ہندوستانی تہذیب ہی غالب رہی اور باہر سے آنے والوں کو اس نے رفتہ رفتہ اپنے رنگ میں رنگ لیا۔

آج ہندوستان کے ہندو اور مسلم عوام میں نہ تو کوئی نسل کا فرق ہے اور نہ تہذیب کا۔ شمالی ہندوستان کے اونچے طبقوں کے اُن چند مسلمانوں میں بھی جو شاید اپنے آپ کو ملک سے علیحدہ سمجھتے ہیں اس ہندوستانی تہذیب کے نقش و نگار کافی اُبھرے ہوئے نظر آرہے ہیں اور ان کی ایرانیت محض نمائشی ہے۔ ان میں سے کسی کو اگر ایران، عرب، ترکی یا کسی دوسرے اسلامی ملک میں بود و باش اختیار کرنی پڑے تو کیا اُسے زندگی سے زیادہ ہم آہنگی میسر ہو سکتی ہے یا اُسے زیادہ گھر کا سا آرام حاصل ہو سکتا ہے؟

دراصل اس سوال کی محض تاریخی اور مکتبانہ دلچسپی ہے کیونکہ موجودہ صنعتی دنیا کی تیز رفتاری اور مختلف قوموں کے متواتر اور پے در پے میل جول سے ایک نئی بین الاقوامی تہذیب رونما ہو رہی ہے جو تمام

قوموں کے تہذیبی حدود توڑ رہی ہے اور اُن کے نقوش مٹاتی چلی جا رہی ہے۔ کیا سر محمد اقبال جو کچھ وسطی ایشیا۔ ٹرکی۔ مصر اور ایران میں ہو رہا ہے اُس پر صاد کرنے کو تیار ہیں؟ یا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں پر اُن طاقتوں کا جو کہ اسلامی ممالک کی صورت تبدیل کئے دے رہی ہیں کوئی اثر نہ پڑے گا۔ وہ اسے پسند کریں یا نہ کریں لیکن دنیا کی طاقتیں تو اس پرانے اور فرسودہ کھنڈر کو گراتی ہی چلی جائیں گی اور اس کی جگہ ایک نئی عمارت ضرور کھڑی کریں گی۔ میں بذاتِ خود اس تبدیلی کا خیر مقدم کرتا ہوں لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ ساری دنیا ایک ہی نمونے پر تعمیر کر دی جائے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ دنیا کی تمام مختلف تہذیبیں رفتارِ زمانہ سے موافقت کرتے ہوئے بھی اپنے بیش بہا خزانے جو انھیں وراثت میں ملے ہیں تلف نہ ہونے دیں۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے مجھے محض یقین ہی نہیں کہ ایک متحدہ ہندوستانی قوم بن سکتی ہے بلکہ باوجود لاتعداد ظاہری اختلافات کے میرا خیال ہے کہ آج بھی اس کی بنیادیں موجود ہیں۔ موجودہ فرقہ وارانہ مسئلہ محض مختلف فرقوں کے اعلیٰ طبقہ کے گروہوں کا تیار کردہ سیاسی معمہ ہے اور اس سے نہ تو نسلی یا تہذیبی معاملات سے کوئی تعلق ہے اور نہ عوام کی اصلی ضروریات سے کوئی مناسبت ہے۔

اب میں سر محمد کے اُس 'صاف سوال' کا جو اُنھیں نے مجھ سے کیا ہے، جواب دیتا ہوں۔ میرے اور اُن کے نظریے میں بڑا فرق ہے اور میں مذہبی اکثریت اور اقلیت کی زبان میں مشکل سے گفتگو کر سکتا ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ میں کچھ کہوں اور وہ کچھ اور سمجھیں، لہٰذا میں الفاظ کو انھیں مفاہیم میں استعمال کرنے کی کوشش کروں گا جن میں سر محمد انھیں صرف کر چکے ہیں۔

میں کسی ایسے اہم مسئلہ کا فیصلہ جس کا تعلق ہندوستان یا ہندوستان والوں سے ہو کسی بیرونی ثالث کے ہاتھ میں چھوڑنے کو تیار نہیں ہوں خصوصاً اس سامراجی طاقت کے ہاتھ میں جو ہم پر حکومت کر رہی ہے اور ہمارے اختلافات اور خامیوں سے پورے طور پر فائدہ اٹھا رہی ہے۔ میں اس بات سے متفق ہوں کہ اکثریت کو چاہیے کہ وہ اقلیت کے اُن حقوق کو جو اس کی پناہ اور حفاظت کے لئے کم سے کم ضروری ہیں تسلیم کر لے۔ لیکن یہ کم سے کم حقوق کیا ہیں! اور ان کا فیصلہ کرنے والا کون ہے! کیا اقلیت خود؟ عام طور پر میں یہ بھی ماننے کے لئے تیار ہوں گو یہ ممکن ہے کہ کچھ ایسے معاملات جو قومی زندگی کیلئے نہایت اہم ہیں مستثنیٰ کرنا پڑے۔ بالفعل ہم ان مستثنیات کو خارج از بحث کرتے ہیں۔ ہاں پھر یہ کیسے معلوم کیا جائے کہ اقلیت دراصل کیا چاہتی ہے؟ کیا کسی ایسے چھوٹے گروہ کی جو اپنے آپ کو اس اقلیت کا نمائندہ ظاہر کرتا ہو رائے مان لی جائے! اور جب ایسے کئی ایک گروہ ہوں تب کیا کیا جائے؟ مسلم لیگ یا مسلم کانفرنس دونوں جماعتوں میں سے کوئی

نہ تو جمہوری ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے اور نہ مسلمانوں کے نمائندہ ہونے کا۔ اور مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد اُن کے مطالبات کے مخالف ہے۔ مسلم لیگ کی کونسل (ظاہرا طور پر تو یہ ایک ہوائی چیز معلوم ہوتی ہے جس کا کسی جسم سے تعلق نہیں) محض چند ایسے افراد کا گروہ ہے جو قریب قریب مستقل ہے اور جو یا تو اپنا انتخاب خود کر لیتے ہیں یا گھڑی گھڑی اپنے آپ کو نامزد کر دیتے ہیں۔ مسلم کانفرنس کی تنظیمی صورت بھی ایسی رکھی گئی ہے کہ وہ سرکاری آئین ساز مجالس کے مسلمان ممبروں کے زیر اثر ہے۔ یہ جماعتیں مسلمانوں کی نمائندگی کی دعویدار کس طرح بن سکتی ہیں خصوصاً مسلم عوام کی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ممکن ہے کہ یہ کبھی کبھی کسی مروج خیال یا عام جذبے کی ترجمانی کر دیا کریں۔ پھر کیا وہ گروہ بھی جس کو حکمران سامراجی طاقت نے مسلم عوام کا نمائندہ انتخاب کر کے گول میز کانفرنس میں بھیجا قابل توجہ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ یہ بڑی قابل قدر ہستیاں ہوں لیکن یقیناً ان کی نمائندوں کی حیثیت نہیں ہے۔

یہ جاننے کے لئے کہ ہندوستان کے مسلمان کیا چاہتے ہیں ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ اُن سے اُن کے دل کی بات پوچھی جائے۔ اس بات کے دریافت کرنے کا جمہوری طریقہ تو یہی ہے کہ وہ خاص اس امر کے لئے اپنے نمائندے جس قدر کثیر التعداد رایوں سے ممکن ہو سکے چنیں۔ بہتر تو یہی ہوگا کہ ہر جوان العمر کی رائے لی جائے اور اس طرح سے جو فیصلہ

وہ کریں گے میں اُس کو قبول کرنے کو پورے طور پر راضی ہوں۔

میں سر محمد اقبال سے یہ بھی درخواست کروں گا کہ وہ اپنی چودہ شرائط پر جو مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے کم سے کم ضرور سمجھی جاتی ہیں ایک نظر ڈالیں اور اگر ان میں کوئی ایسی چیز ہو جس سے مسلم عوام کی ترقی یا بہبودی کی گنجائش ہو تو وہ مجھے بتائیں۔ یہ تو وہ جانتے ہیں کہ سیاسیات سے میری خاص دلچسپی صرف یہی ہے کہ عوام کی ترقی ہو اور جو حد بندیاں کہ دولت اور درجہ کی ہماری معاشرت میں موجود ہیں وہ مٹا کر ایک تمدنی ہمواری قائم کی جائے۔ لیکن غالباً نہ تو ان شرائط کے بنانے والوں نے نہ کبھی ان کے پیش کرنے والوں نے اس نقطۂ نظر سے ان پر غور کیا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ میں ان کا بہت پُرجوش خیر مقدم نہیں کر سکتا۔ لیکن پھر بھی اگر مسلمان اس جمہوری طریقے سے جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں یہی مطالبات پیش کریں تو میں انھیں تسلیم کر لوں گا اور مجھے کامل یقین ہے کہ مجموعی طور پر ملک بھی انھیں قبول کر لے گا۔ مگر میرا یہ خیال ضرور ہے کہ جب مسلم عوام کی رائے لی جائے گی تو وہ بہ نسبت اُن مطالبات کے جو محض چند اونچے طبقہ والوں سے وابستہ ہیں اُن اقتصادی مطالبات پر جن کا کہ ان کی نیز غیر مسلم عوام کی زندگی سے گہرا تعلق ہے کہیں زیادہ اصرار کریں گے۔

ہندوستان کا سیاسی مسئلہ ہندوستان والے ہی بغیر کسی بیرونی طاقت کے دخل دئے ہوئے حل کر سکتے ہیں۔ اسی طرح فرقہ وارانہ سوال بھی طے کیا

جا سکتا ہے۔ اور دونوں کے حل کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ عوام سے جواب طلب کیا جائے۔ سیاسی مسئلہ کا تصفیہ صرف ایک ایسی مجلس شوریٰ کر سکتی ہے جس کا انتخاب ہر جوان العمر یا قریب قریب ہر جوان العمر کی رائے سے ہوا ہو۔ میں ذاتی طور پر تو اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ اقلیتوں کو اگر وہ چاہیں تو اپنے نمائندے اپنی مخصوص جماعت کی رائے سے منتخب کرنے کا حق دیا جائے۔ ان نمائندوں کو اس اقلیت کی طرف سے جس نے ان کو منتخب کیا ہے بولنے کا پورا پورا حق ہوگا اور کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ ان کے انتخاب میں اکثریت کا کوئی ہاتھ ہے۔ یہ لوگ فرقہ وارانہ مسئلہ پر غور کریں اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں میں ان مسلمان نمائندوں کا مطالبہ تسلیم کرلوں گا۔

سر محمد اس بات کو ملاحظہ فرمائیں گے کہ میں اُن کے سامنے اس مسئلہ کے حل کرنے کا ایک ایسا طریقہ پیش کر رہا ہوں جو کہ جمہوری بھی ہے اور جس پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں تو کانگریس کو بھی اس سے بالکل علٰحدہ کیے دے رہا ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو کانگریس خوشی سے دُور کھڑی ہو جائے گی اور اس میں کوئی دخل نہ دے گی۔

اس لئے میری طرف سے سر محمد اقبال کے سوال کا جواب یہ ہے۔ میرے نزدیک محض وہی دو طریقہ نہیں ہیں جن کا ذکر انھوں نے کیا ہے بلکہ

اور بھی راستہ ہیں۔ بہر حال یہ ان کو بخوبی جاننا چاہیے کہ اگر کوئی فرقہ چھوٹا یا بڑا سامراجی حکومت سے اتحادِ عمل کرے گا تو اس کو ہندوستانی قومیت کی سخت مستقل اور پیہم مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ در اصل ایسا تو کوئی ملت یا اقلیت کر ہی نہیں سکتی ہے۔ صرف چند سر برآوردہ افراد یا کچھ اونچے طبقہ کے لوگ ایسا کر سکتے ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے ہر ملت اِس سے نقصان اٹھا رہی ہے۔ عوام سامراجی حکومت سے کبھی کسی قسم کی مصالحت نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے لئے تو اس کی بندشیں توڑنا ہی صرف ایک راہ نجات ہے۔

میں ہندوستان کو مذہبی طور پر تقسیم کرنا کا بھی قائل نہیں ہوں۔ ایسے فرق پیدا کرنا نہایت نامناسب ہیں اور موجودہ دنیا میں ان کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن میں اس کے مخالف نہیں ہوں کہ موجودہ صوبوں کی ساخت اور شکل تبدیل کر دی جائے تا کہ خاص گروہوں کو اپنی تہذیب کو ترقی دینے کا پورا موقع ملے۔

"قید خانہ کی دُنیا"

ایک انگریزی رسالہ کے کسی حال کے پرچہ میں ایک مضمون نگار یہ لکھتے ہیں کہ سیاست کی کشاکش اور جیل خانہ کی زندگی کی سختیوں نے مجھے بالکل توڑ دیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اُن کی اطلاع کے ذرائع کیا تھے لیکن اُس اندرونی واقفیت کی بنا پر جو کہ اپنے جسم اور دل و دماغ کے بارے میں مجھے کافی طور پر حاصل ہے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ سب کافی مضبوط اور تندرست ہیں اور ان میں سے کسی کے عنقریب بگڑنے یا بیکار ہو جانے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ خوش قسمتی سے میں نے اپنی صحت کو ہمیشہ اہم سمجھا اور گو کہ اکثر میں اپنی تندرستی کا کافی خیال نہ رکھ سکا پھر بھی یہ نوبت کہ میں بیمار ہو جاؤں بہت کم آئی۔ دماغی صحت تو کوئی نظر آنے والی چیز نہیں ہے لیکن میں نے اس کی بھی کافی نگہداشت کی ہے اور ایک حد تک میں یہ سمجھتا ہوں (ممکن ہے کہ یہ محض شیخی ہو) کہ یہ شئے لطیف بھی میرے پاس بہت سے ایسے لوگوں کے

مقابلہ میں جنھوں نے سیاسی میدان میں نہ کبھی قدم رکھا ہے اور نہ کبھی دُور سے بھی جیل خانہ کا دروازہ دیکھا ہے کہیں زائد ہے۔

لیکن میری تندرستی یا بیماری تو ایک ایسی چھوٹی سی بات ہے جس پر کسی کو پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے حالانکہ میرے دوستوں اور اخباروں نے اسے غیر ضروری اہمیت دیدی ہے۔ قومی اور اخلاقی اعتبار سے جو بات کہ اس سے کہیں زیادہ اہم ہے وہ ان جیل خانوں کی حالت اور فضا ہے اور یہاں کے لاتعداد رہنے والوں کے مجموعی طور پر دلی اور دماغی تاثرات ہیں۔ یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے کہ بہت سے بہادر مضبوط آدمی جیل کی سختیاں برداشت نہ کر سکے اور یہاں تک ہوا کہ بند رہتے رہتے ان کی صحت نے بالکل جواب دے دیا۔ میں نے اپنے قریب ترین اعزا کو جیل خانہ کی تکلیفیں سہتے دیکھا ہے اور میرے دوستوں کی فہرست تو بہت لمبی اور دردناک ہے۔ حال ہی میں جے، ایم، سین گپتا۔ ایک ذی قدر رفیق جو میرا پچیس ۲۵ سال کا ملاقاتی اور دوست تھا اور جس سے میں پہلے پہل کیمبرج (Cambridge) میں ملا تھا اور جو اس بدنصیب ملک کے بہادروں میں بھی بہادر شمار کیا جاتا تھا اس قید کی تاب نہ لا سکا اور جیل خانہ ہی میں موت کا شکار ہوا۔

یہ قدرتی بات ہے کہ ہمیں اپنے جاننے والوں اور ساتھیوں کی تکلیف

اور مصیبت کا احساس اُن ہزاروں مصیبت زدوں کے دُکھ، درد کے مقابلہ میں جن سے ہم واقف نہیں ہیں زائد ہوتی ہے۔ پھر بھی میں جو کچھ اس وقت لکھ رہا ہوں یہ اپنے دوستوں کے لئے نہیں لکھ رہا ہوں۔ ہم میں سے جو لوگ کہ اپنی خوشی اور مرضی سے اس بھیانک آہنی دروازہ کو پار کر کے اندر داخل ہوئے ہیں اُن کی کوئی نیت اس برتاؤ کے خلاف جو یہاں ان کے ساتھ کیا جاتا ہے کسی قسم کا شکوہ یا شکایت کرنے کی نہیں ہے۔ اگر ہمارے کچھ ہموطنوں کو اس مسئلہ میں دلچسپی ہے یا یہ سوال اُٹھانا چاہتے ہیں تو یہ اُن کا فرض ہے کہ وہ اس کے خلاف اپنی آواز بلند کریں۔ ایسے سوال جب کبھی اٹھائے جاتے ہیں تو عام طور پر وہ کسی خاص مشہور شخص کا نام لے کر اُٹھائے جاتے ہیں اور اُس کے دنیاوی اقتدار کا حوالہ دے کر مخصوص رعایت کا سوال کیا جاتا ہے۔ اس شورش کو مٹانے کے لئے گنتی کے چند آدمیوں کو 'اے' یا 'بی' کلاس دے دیا جاتا ہے لیکن قیدیوں کی بہت بڑی جماعت کو جو کہ غالباً پچانوے ۹۵ فی صدی سے بھی زائد ہے جیل خانہ کی زندگی کی پوری سختیاں بھگتنا پڑتی ہیں۔

قیدیوں کی اس درجہ وار تفریق پر اکثر اعتراضات کئے گئے ہیں اور یہ اعتراضات حق بجانب ہیں۔ یہ تفریق کسی حد تک حفظان صحت کے اصول پر جائز قرار دی جاسکتی ہے کیونکہ جن لوگوں کو دوسرے قسم کا کھانا

کھانے کی عادت ہے اگر ان کو جیل خانہ کا عام کھانا کھانے کو دیا جائے، تو وہ یقیناً کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہو جائیں گے چنانچہ اس کی کئی ایک مثالیں موجود ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ بہت سے لوگ جسمانی طور پر سخت محنت اور مشقت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ اِن کے علاوہ 'سی' کلاس والوں کو وہ مخصوص حقوق نہ دینے کی جو کہ 'اے' اور 'بی' کلاس والوں کو حاصل ہیں مشکل ہی سے کوئی وجہ سوچی جا سکتی ہے۔ اونچا درجہ اُس شخص کو دیا جاتا ہے جس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ شخص زیادہ ذی حیثیت ہے یا جس کو زیادہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ یہ طے کرنے کے لئے کہ کوئی شخص ذی حیثیت ہے کہ نہیں ایک رائج طریقہ یہ ہے کہ جو رقم وہ بطور مالگذاری کے دیتا ہے اُس سے اندازہ لگایا جاتا ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص زیادہ مالگذاری دیتا ہے اس کو اپنی بیوی بچّوں سے زیادہ محبت ہے اور اس لئے اُس کو خط بھیجنے یا ملاقات کرنے کی زیادہ ضرورت ہے؟ کیا اُس کے دماغ کی بےچینی کچھ زیادہ ہے یا اُس کا دل زیادہ گھبراتا ہے جس کی تسکین کے لئے اس کو لکھنے یا پڑھنے کی زیادہ آسانیاں ملنا چاہئیں۔ جو لوگ کہ بڑی بڑی رقمیں مالگذاری میں دیتے ہیں عام طور پر دماغی اوصاف یا ذہنی بلندی کی تہمت اُن پر نہیں لگائی جا سکتی۔

میں نے جو کچھ کہا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جن لوگوں کو یہ مخصوص

حقوق حاصل ہیں وہ اُن سے چھین لئے جائیں۔ یہ حقوق ہیں ہی کیا جو کوئی ان کو چھینے! ہم کو خیال رکھنا چاہیئے کہ اور ملکوں میں تو ادنیٰ سے ادنیٰ قیدی کے بھی حقوق یہاں کے اے کلاس کے قیدی سے کہیں زیادہ ہیں۔ اور یہ اے اور بی کلاس کے حقوق بھی اس قدر معدودے چند لوگوں کو دئے جاتے ہیں کہ اس ملک کے جیل خانوں کی زندگی پر مجموعی نظر ڈالنے کے وقت یہ آسانی سے فروگذاشت کئے جا سکتے ہیں۔ دراصل قیدیوں کو 'اے' اور 'بی' درجہ عطا کرنا محض پبلک شورش رفع کرنے کے لئے ایک خواب آور دوا ہے۔ اکثر لوگ جو اصل واقعات سے واقف نہیں وہ اس فریب میں آجاتے ہیں۔

چند اے کلاس کے قیدیوں کو اور خاص طور پر ڈٹنوز Detenus یا سرکاری قیدیوں کو اکثر ایک خاص مصیبت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اُن کو بغیر کسی ساتھی کے مہینوں تک اکیلا رکھا جاتا ہے اور یہ تو ہر ڈاکٹر جانتا ہے کہ ایسی تنہائی ایک معمولی انسان کے لئے نہایت درجہ مضر ہے۔ یہ تو محض چند آدمی ہیں جنھوں نے اپنے دماغوں کو ایسی تعلیم اور تربیت دی ہے جو محض اپنے خیالوں کو رفیقِ حیات بنا سکتے ہیں اور اس طرح اس تنہائی کے بُرے اثرات سے بچ سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہر ایسے قیدی یا ڈٹنو (Detenu) کو جیل خانہ کے کسی افسر سے روزانہ چند منٹ گفتگو کرنے کا

موقع دیا جاتا ہے لیکن اس رعایت کا خوشی خوشی کوئی فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا - یہ قید تنہائی کا اصول حکومت نے ظاہرا طور پر جان بوجھ کر کسی مصلحت کی بنا پر رکھا ہے - مجھے یاد پڑتا ہے کہ دسمبر ۱۹۳۱ء میں جب میں گرفتار کیا گیا تھا اُسی زمانے میں پیشاور یا چرساوا میں خان عبدالغفار خاں بھی پکڑے گئے تھے - اُن کے ساتھ اُن کے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب - ڈاکٹر خاں صاحب کا ایک جوان بیٹا اور ایک ان کا ساتھی یہ چاروں آدمی ساتھ ہی ساتھ گرفتار ہوئے تھے - یہ سب ایک اسپشل ٹرین پر لائے گئے تھے اور چار مختلف شہروں میں الگ الگ جیلخانوں میں بند کئے گئے تھے - ان سب کا ایک جگہ رکھنا یا کم سے کم باپ بیٹے کا یا بھائی بھائی کا ساتھ رکھنا بالکل آسان بات تھی لیکن مصلحتاً ایسا نہیں کیا گیا اور میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص بغیر کسی ساتھی کے علحدہ علحدہ بند کیا گیا - کم سے کم ڈاکٹر خاں صاحب کے بارے میں میں جانتا ہوں کہ وہ اس طرح نینی جیل میں رکھے گئے - ایک مہینے سے زائد میں بھی نینی جیل میں تھا لیکن ہم لوگ الگ الگ رکھے جاتے تھے اور ملنے کی اجازت نہ تھی - مجھے یہ بات خاص طور پر ستاتی تھی کیونکہ ڈاکٹر خان صاحب میری ولایت کی طالب علمی کے زمانے کے لنگوٹے یار تھے اور میں اُن سے برسوں سے نہ مل سکا تھا -

جو سوال میں نے اٹھایا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ سیاسی قیدیوں کے ساتھ

رعائتی سلوک ہونا چاہیئے۔ میں بخوبی جانتا ہوں کہ یہ برتاؤ روز بروز بُرا ہی ہوتا جائے گا جس کا کہ پچھلے بارہ سال کے تجربہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کو صرف پبلک کا مطالبہ روک سکتا ہے لیکن آخر میں اس کی بھی زیادہ وقعت نہیں ہوتی جب تک کہ یہ اتنا ہی پُر زور اور قوی نہ ہو کہ اس کی کامیابی یقینی ہو اور یہ رد نہ کیا جا سکے۔

لہذا یہ بات تو ظاہر ہے کہ سیاسی قیدیوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ جو برتاؤ ان کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ بتدریج بد تر ہی ہوتا چلا جائے گا۔ سنہ ۱۹۳۰ء لغایت سنہ ۱۹۳۱ء میں جو برتاؤ تھا وہ سنہ ۱۹۲۱ء لغایت سنہ ۱۹۲۲ء کے مقابلہ میں زیادہ بُرا تھا اور سنہ ۱۹۳۲ء کا اور بھی زیادہ خراب تھا۔ آج جیل خانہ میں ایک معمولی سیاسی قیدی کی زندگی ایک غیر سیاسی قیدی کی زندگی کے مقابلے میں کہیں زیادہ سخت ہے۔ ہر امکانی کوشش اس کو ستانے کی کی جاتی ہے تا کہ وہ معافی مانگ لے یا کم سے کم اتنا پریشان ہو جائے کہ پھر جیل خانہ آنے کا بھولے سے بھی خیال نہ کرے۔

سر سیمول ہور (Sir Samuel Hoare) کی طرف سے ہاؤس آف کامنز (House of Commons) میں یہ بیان دیا گیا ہے کہ سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلہ میں پانچسو سے زائد آدمیوں کو ہندوستان میں کوڑے مارے گئے۔ ایک ملک کی تہذیب کا اکثر اس بات سے اندازہ

لگایا جاتا ہے کہ آیا وہاں سزائے تازیانہ رائج ہے کہ نہیں۔ بہت سی ترقی یافتہ سلطنتوں میں تو اس کا نام بھی نہیں ہے اور جن حکومتوں میں یہ ابھی کُلیتاً منسوخ نہیں کی گئی ہے وہاں یہ محض نہایت ذلیل، وحشیانہ اور جابرانہ جرائم (مثلاً ایک کم عمر لڑکی کے ساتھ زنا بالجبر وغیرہ) کے لئے مخصوص ہے۔ میرا خیال ہے کہ چند ماہ ہوئے جب اسمبلی میں اس بات پر مباحثہ بھی ہوا تھا کہ اس سزا کا چند غیر سیاسی جرائم کے لئے رکھنا مناسب ہے کہ نہیں۔ حکومت کے طرفداروں نے یہ تقریریں کی تھیں کہ چند مخصوص وحشیانہ جرائم کے لئے اس کا قائم رکھنا نہایت ضروری ہے۔ غالباً ہر شخص جس نے انسان کے دماغ کا جائزہ لیا ہے یا جو ماہر نفسیات ہے اس کی رائے اس کے خلاف ہے کیونکہ وحشیانہ سزا دے کر وحشیانہ جرائم کے انسداد کی کوشش کرنے سے بڑھ کر زیادہ حماقت آمیز کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن باوجود اس کے ہمارے ملک میں یہ آئے دن کی بات ہے کہ جیل خانہ کی معمولی سے معمولی قواعد شکنی پر یا محض کتابی تعریف والے سیاسی جرائم پر جن میں کسی قسم کی اخلاقی بدعنوانی کا شائبہ بھی نہیں بیچارے مجرموں کو بیت لگائے جاتے ہیں۔

لیکن ہماری عورتوں کو جیل خانوں میں اس سے بھی زیادہ سختیاں برداشت کرنا پڑی ہیں۔ سیکڑوں عورتوں کو سزا دی گئی تھی اور اُن میں سے شاذونادر کو 'اے' یا 'بی' کلاس دیا گیا تھا۔ یوں بھی عورت کی زندگی جیل

سیاسی قیدی ہو یا غیر سیاسی) جیل خانہ میں مرد کے مقابلے میں کہیں زیادہ سخت ہے۔ مرد تو پھر جو کام ان سے لیا جاتا ہے اس سلسلہ میں گھومتے پھرتے ہیں۔ اس حرکت اور تبدیلی سے کسی حد تک ان کے دماغوں میں ایک تازگی سی رہتی ہے۔ عورتوں سے گو کہ اتنا سخت کام نہیں لیا جاتا لیکن اُنھیں ایک تنگ جگہ میں بند رہنا پڑتا ہے اور ان کی زندگی بالکل یکرنگ ہو جاتی ہے جس میں نہ کوئی حرکت ہے اور نہ کوئی تبدیلی۔ اس کے علاوہ جو عورتیں کہ جیل خانوں میں ہوتی ہیں وہ عام طور پر بحیثیت ساتھی کے مرد قیدیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ خراب ہوتی ہیں۔ مردوں میں تو کافی تعداد ایسے قیدیوں کی ہوتی ہے جن کی مجرمانہ ذہنیت نہیں ہوتی اور جو معمولی سیدھے سادے گاؤں والے ہوتے ہیں اور جنھیں کسی وقتی مار پیٹ کے سلسلہ میں جس کا تعلق زمینداری کے جھگڑوں سے ہوتا ہے لمبی لمبی سزائیں مل چکی ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے عورتوں میں مجرمانہ فطرت والیوں کی تعداد بہت زائد ہوتی ہے۔ سیاسی قیدیوں میں جو عورتیں تھیں ان میں ایک کثیر تعداد ہنس مکھ جوان لڑکیوں کی تھی اور اُن کو اس ناپاک فضا میں زندگی بسر کرنا پڑی۔ میں تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ جو کچھ بدسلوکی بھی ہمارے ساتھ جیل خانوں میں یا جیل خانوں کے باہر کی گئی ہے وہ اس سختی کو نہیں پہونچتی جو ہماری عورتوں کے ساتھ کی گئی۔

میں نہیں چاہتا کہ کسی عورت کے ساتھ بھی (چاہے وہ کسان یا مزدور

کی بیوی ہو یا کسی ساہوکار کی بیٹی) وہ سلوک کیا جائے جو ہمارے جیل خانوں میں عورتوں کے ساتھ کیا گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ سیاسی قیدیوں میں سے زیادہ تر عورتیں بلکہ قریب قریب سب عورتیں اونچے طبقہ یا اوسط طبقہ کے خاندانوں کی تھیں۔ کسان ممکن ہے کہ خود سیاسی جذبہ کے ماتحت جیل چلا جائے لیکن اس بات کا امکان کم ہے کہ اس کی بیوی بھی اس وجہ سے قیدی بنے۔ حکومت کے نقطۂ نظر سے تو مجموعی طور پر عورت قیدیوں کی حیثیت مرد قیدیوں کے مقابلہ میں زائد ہونی چاہیے تھی۔ لیکن وکیلوں، تاجروں اور بینک منیجروں کی بیویوں کو 'سی' کلاس دیا گیا تھا۔ وہ خواتین جن کے یہاں مہمان بن کر رہنے کا مجھے شرف حاصل ہو چکا تھا وہ بھی 'سی' کلاس میں رکھی گئیں۔

یو، پی، لیجسلیٹو کونسل (U. P. Legislative Council) میں پچھلے سال اُس وقت کے ہوم ممبر نے دورانِ تقریر میں یہ ارشاد فرمایا کہ اگر سیاسی قیدیوں کی آسائش کا زیادہ خیال کیا گیا تو تمام چور۔ ڈاکو۔ بدمعاش سیاسی قیدی بن کر جیل خانوں کو بھر دیں گے۔ یہ سُن کر اکثر ممبروں کے خوف کی وجہ سے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ عورت قیدیوں کی سختیاں کم کرنے کے خلاف بھی انھوں نے کچھ اسی قسم کے عذرات پیش کیے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دلیلیں جن کے سامنے پیش کی گئی تھیں اُن میں سے زیادہ تر کی ذہنی قابلیت کے اعتبار سے یہ نامناسب نہیں تھیں اور

وقتی طور پر ان سے کام بھی نکالا گیا۔ لیکن ہم میں سے اُن لوگوں کے لئے جو ابھی تاریکی میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان ممبروں کے برابر روشن دماغ نہیں ہیں اس تقریر نے عجیب و غریب انکشافات کئے۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ ہوم ممبر صاحب کس قدر زبردست ماہر نفسیات ہیں اور انھوں نے ڈاکوؤں کے طبائع۔ مجرمانہ ذہنیت اور انسانی فطرت کا کتنا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہوم ممبر صاحب خود نہ سمجھے ہوں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں یا ہم ان کی باتوں کو صحیح مانتے ہوئے بھی کسی دوسرے نتیجہ پر پہونچیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ایک ڈاکو اگر جیل خانہ میں اُسے سختی کا ڈر نہ ہو خوشی خوشی جیل خانہ جانے کو تیار ہو جائے گا اور ڈاکہ زنی چھوڑ دے گا تو ظاہر ہے کہ اگر جیل خانہ کے باہر بھی اس کو ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے میں دقت نہ ہو اور تھوڑا بہت بھی سکون اور آسائش اُسے نصیب ہو تو وہ اپنے مجرمانہ افعال سے باز رہنے کے لئے بہت جلدی رضامند ہو جائے گا۔ یعنی جو چیز کہ اُسے جرم کرنے کی ترغیب دیتی ہے وہ اس کی فاقہ مستی اور مصیبت ہے۔ اگر اس اقتصادی محرک کو ہٹا دیا جائے تو ڈاکہ زنی بند ہو جائے۔ لہذا محض سخت سزا دینے سے جرموں کا انسداد نہیں ہو سکتا جب تک کہ تحریکِ جرم کے بنیادی اسباب دور نہ کئے جائیں لیکن میں پچھلے سال کے ہوم ممبر صاحب پر یہ الزام لگانا نہیں چاہتا کہ ان کے

ذہن میں یہ عمیق اور انقلابی خیالات موجود تھے چاہے وہ منطقی طور پر ان کی تقریر کا لازمی نتیجہ ہی کیوں نہ ہوں۔ اُن کی تقریروں میں اس قسم کے جواہر پارے اکثر پائے جاتے ہیں جس سے ہم کو اُس گنجِ گراں مایہ کا اندازہ ہوتا ہے جو اُن کے دماغ میں محفوظ ہے اور اُن کے ایمان کو جانتے ہوئے اُن پر اس کُفر کی تہمت نہیں رکھی جا سکتی۔

سیاسی قیدیوں کا مجموعی طور پر اکثر حوالہ دیا جاتا ہے اور حکومت نے ابھی تک ان میں کسی قسم کی کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ موجودہ حالات کا خیال رکھتے ہوئے میرے نزدیک اس میں تو حکومت کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ سیاسی قیدی کون ہیں؟ تحریک سول نافرمانی کے قیدیوں کو آسانی سے علٰحدہ کیا جا سکتا ہے لیکن کسی سیاسی تحریک میں حصہ لینے والے کو جو حکومت کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہو گرفتار کرنے کے لئے مختلف قوانین اور احکام کی بہت سی دفعات ہیں۔ دیہاتوں میں کسان۔ نیتاؤں اور کام کرنے والوں کو آئے دن ضابطہ فوجداری کی دفعات میں یا اس سے بھی زیادہ سنگین الزامات لگا کر پکڑ لیا جاتا ہے۔ یہ گروہ بھی اُسی حد تک سیاسی قیدی ہے جس حد تک دوسرا گروہ اور اس کی تعداد بہت کافی ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں یہ طرزِ عمل اتنا عام نہیں ہے کیونکہ اس کی تشہیر کا خطرہ زائد ہے۔

اونچی دیواریں اور آہنی پھاٹک قید خانے کی چھوٹی سی دنیا کو اِس

بڑی دنیا سے علیٰحدہ کر دیتے ہیں۔ اس چار دیواری کے اندر ہر چیز کی صورت بدل جاتی ہے۔ میعادی قیدیوں کے لئے نہ تو مختلف رنگ ہیں نہ مختلف موسم۔ نہ کوئی تبدیلی ہے نہ کوئی حرکت۔ نہ کسی اُمید کی جھلک ہے نہ کسی مسرت کی گنجائش۔ زندگی صرف ایک بے رنگ یکسانیت کا نام ہے جو ایک ہی طور پر گذرتی چلی جاتی ہے۔ ایک وسیع ریگستان ہے جس میں کوئی نخلستان نہیں جس کے سایہ میں بیٹھ کر کوئی جلتی ہوئی دھوپ سے بچ سکے یا دم لے کر تھکن دُور کر سکے۔ کوئی چشمہ نہیں جس سے پیاس بجھانا تو درکنار اپنے سوکھے ہونٹوں کو تر ہی کر سکے۔ دن ایک ہی طرح کٹتے کٹتے ہفتے بن جاتے ہیں۔ ہفتے رفتہ رفتہ مہینوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مہینے جُڑتے جُڑتے سال ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ زندگی کی میعاد پوری ہو جاتی ہے۔

حکومت کی پوری طاقت اُس کے خلاف ہوتی ہے اور اس سے مقابلہ کرنے کے لئے یا بچنے کے لئے نہ تو اس کے پاس کوئی ہتھیار ہوتا ہے اور نہ کوئی سپر۔ اس کی دردناک چیخیں بھی ان اونچی دیواروں کے باہر سُنائی نہیں دیتیں۔ اس کی فریاد بھی اس کے کانپتے ہوے ہونٹوں تک آتے آتے رُک جاتی ہے۔ کتابی اعتبار سے کچھ رکاوٹیں اس خیال سے ضرور رکھی گئی ہیں کہ اُس پر بیجا تشدد نہ کیا جا سکے۔ پبلک کے کچھ افراد یا چند حکام ضرور مقرر کئے گئے ہیں کہ وہ جیل خانوں کا معائنہ کیا کریں۔

لیکن کسی قیدی میں اتنی ہمت شاذ و نادر ہی ہوتی ہے کہ وہ کوئی شکایت کرے اور جو ایسا کرتے ہیں اُن کو اس ہمت کی سزا بھگتنا پڑتی ہے۔ کیونکہ معائنہ کرنے والا تو چلا جاتا ہے لیکن جیل خانے کا عملہ رہ جاتا ہے اور انھیں سے قیدی کو روزانہ کام پڑتا ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ایسی صورت میں وہ شکایت کرکے اپنی تکالیف میں اضافہ ہونے کا خطرہ گوارا کرنے کے بجائے اپنی موجودہ مصیبتوں کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرنا ہی بہتر سمجھتا ہے۔

سیاسی قیدیوں کی کثیر تعداد میں جیل جانے سے قید خانوں کے تاریک گوشوں میں بھی کچھ روشنی پہونچی۔ میعادی قیدی کے تنگ اور تیرہ و تار حجرے میں بھی تازہ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا۔ پبلک کو اُن کی سختیوں کا کچھ احساس ہوا اور حالات کسی قدر رُو بہ اصلاح ہوئے لیکن یہ اصلاحات برائے نام ہوئے اور در اصل طرزِ عمل جیسا تھا ویسا ہی قائم رہا۔ کبھی کبھی جیل خانوں میں بلوہ ہو جانے کی خبر سُنائی دیتی ہے۔ اس سے حقیقتاً کیا بات ظاہر ہوتی ہے؟ ممکن ہے کہ بیچارے قیدیوں ہی کا قصور ہو۔ تاہم نہتے، کمزور اور بے یار و مددگار قیدیوں کا جو کہ ایک اونچی چار دیواری میں بند ہیں جیل کے افسروں کی مسلح طاقتوں کے خلاف لڑنے پر آمادہ ہونا ایک مجنونانہ بات ہے۔ اس کا ایک ہی نتیجہ ہو سکتا ہے اور لازمی طور پر یہی خیال دل میں آتا ہے کہ صرف ناقابل برداشت سختی اور

انتہائی درجے کی مایوسی ہی قیدیوں کے اس احمقانہ اور از خود رفتہ فعل کی محرک اور ذمہ دار ہو سکتی ہے۔

ان وارتوں کی محکمہ کی طرف سے جانچ ہوتی ہے اور شاید کبھی کبھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی تحقیقات کرتے ہیں۔ ان میں غریب قیدی کی شنوائی کی کیا گنجائش ہے؟ ایک طرف تو پوری قابلیت سے تیار کیا ہوا مقدمہ جس کی سارا عملہ اور بہت سے ایسے قیدی جن کے لئے ان کا حکم ماننا فرض ہے تائید کرتے ہیں دوسری طرف ہتھکڑی اور بیڑی میں جکڑا ہوا ایک سہما ہوا اور کانپتا ہوا قیدی جس کو کہ انسانوں نے اچھوت قرار دیدیا ہے جس سے کسی کو ہمدردی نہیں اور جس کی بات کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں۔ یو، پی گورنمنٹ کے جوڈیشل سکریٹری صاحب نے پچھلے نومبر میں مقامی کونسل میں دَورانِ تقریر میں یہ فرمایا تھا کہ جو لوگ کہ جیل خانوں میں بند کئے گئے ہیں وہ جنبہ دار ہیں لہذا ان کے بیانات قابلِ اعتماد نہیں سمجھے جا سکتے۔ بیچارہ قیدی جس کے جسم پر ضربات کے نشانات موجود ہیں وہ خود تو فریق مقدمہ ٹھہرا لہذا اُس کی شہادت تو ظاہر ہے کہ باور نہیں کی جا سکتی۔ ایسی صورت میں یو، پی گورنمنٹ سے یہ امر دریافت طلب ضرور ہے کہ مظلوم قیدی بجز اوپر والی آسمانی طاقتوں کے اور فوق القدرت غائبانہ گواہوں کے کون شہادت پیش کر سکتا ہے؟

حکومت کی خفیہ تحقیقاتوں کے اس مزاحیہ پہلو سے لطف اندوز ہوا جاسکتا تھا اگر ان کی تہ میں غم کی ایسی دردناک داستان پوشیدہ نہ ہوتی۔ سرسیمول ہور (Sir Samuel Hoare) کو واجبی طور پر غصہ چڑھتا ہے جب پولیس یا جیل کے عملہ کی بدعنوانیوں کی شکایت کی جاتی ہے اور وہ کسی پبلک یا غیر جانبدار تحقیقات کا مطالبہ ہمیشہ رد کردیتے ہیں۔ مجھے خیال آتا ہے کہ قریب ڈیڑھ سال ہوئے ہجلی (Hijli) کے واقعہ کے متعلق پہلے محکمہ کی طرف سے تحقیقات ہوئی تھی۔ اُس کے تھوڑے ہی دن بعد جب حکومت کی طرف سے اس کی جانچ ہوئی تو انھوں نے جیل کے عملہ کے قصے کو بالکل جھوٹا قرار دیا۔ لیکن ایسا شاذونادر ہوتا ہے۔ عام طور پر محکمہ کی تحقیقاتوں کی کوئی جانچ نہیں کی جاتی اور ان کی مثال کے لئے سرولیم گلبرٹ (Sir William Gilbert) کے دلچسپ ناٹک ذہن میں آتے ہیں بلکہ وہ غیر فانی اور معرکۃ الآرا تصنیف "تارا بٹیا انوکھی دنیا میں"[1]، جس سے کہ ہر بچہ واقف ہے ان سے بھی زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ نے Alice in Wonderland کا یہی ترجمہ کیا ہے اور بہت لوگ اس نام سے واقف ہوچکے ہیں ایسی صورت میں میں نے یہ نامناسب خیال کیا کہ میں بھی یہی نام قبول کرلوں اور انگریزی نام نہ لکھوں۔

یہ بلّی نے چوہے سے اک دن کہا — بہت تو نے مجھ کو پریشاں کیا
ارادہ ہے دعویٰ کروں تجھ پہ آج — نہیں ہے مجھے اور کچھ کام کاج
یہ ڈرتے ہوئے موش بولا "حضور — نہیں مجھ سے سرزد ہوا یہ قصور"
"کروں میں یہ گستاخیاں کیا مجال" — بدل ڈالیے اپنے دل کا خیال"
"کوئی اس میں دھوکا ہوا ہے ضرور — میں ثابت کروں گا میں ہوں بےقصور"
یہاں فیصلے کی مگر کون راہ — نہ جج ہی کوئی ہے نہ کوئی گواہ
کہا اس سے بلّی نے "چپ! بدتمیز — کروں گی نہ ضائع میں وقتِ عزیز
کوئی اس میں تاخیر ممکن نہیں — یہ جھگڑا چکے گا ابھی اور یہیں
میں جج ہوں میں جوری میں ہی مدعی — سزا تجھ کو دیتی ہوں میں موت کی

پچھلے سال مجھے خود اس قسم کا ایک ذاتی تجربہ ہوا تھا جس کی کسی قدر عام اہمیت تھی۔ میری ماں اور بیوی میرے بہنوئی سے ملنے الہ آباد ڈسٹرکٹ جیل گئی تھیں اور وہاں کے جیلر نے اُن سے بدزبانی کی اور ان کو نکال دیا۔ مجھے یہ سُن کر بہت غصہ چڑھا۔ تاہم اس امر کی زیادہ اہمیت نہ تھی کیونکہ یہ تو محض ایک گنوار اور ناشائستہ جیلر کی گستاخی تھی مگر مجھے یہ اُمید تھی کہ اس حرکت پر جیل کا کوئی بڑا افسر اظہار افسوس ضرور کرے گا لیکن بجائے اس کے حکومت نے میرے عزیزوں کو بغیر ان سے کچھ پوچھے ہوئے سزا دی۔ ایک طرح یہ سزا مجھ کو بھی ملی کیونکہ کافی عرصہ تک مجھے اپنی ماں

اور بیوی سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ انسپکٹر جنرل صاحب سے جب میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے بھی اپنے جواب میں میری ماں کے متعلق جو اشارے کئے وہ بدتہذیبی سے خالی نہ تھے۔ یہ سب ہو جانے کے بعد حکومت کو صحیح واقعات مجھ سے اور میری ماں اور بیوی کے بیانات سے معلوم ہوئے۔

یہ ظاہر ہے کہ انھوں نے فاش غلطی کی تھی کیونکہ میرے متعدد سوالات پر بھی وہ ہمارے بیانات میں کوئی غلطی یا خامی نکال نہ سکے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ہمارے بیانات کی صحت تسلیم کر لی۔ ایسی صورت میں جو کم سے کم تلافی ان کے لئے ممکن تھی وہ یہی تھی کہ اپنی بیجا حرکت پر نادم ہوتے۔ لیکن میں آج تک اُن کے پر خلوص اظہار افسوس کا انتظار کر رہا ہوں۔

اگر میری ماں اور بیوی سے ایسا برتاؤ کیا جا سکتا ہے اور اس کے بعد حکومت ایسی عجیب ضد سے کام لے سکتی ہے تو ایک معمولی گمنام قیدی اور اُس کے عزیزوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہوگا وہ بخوبی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ ہماری حکومت کا سارا نظام مثل ایک ڈھانچے کے ہے جو کہ اوپر سے پہنا دیا گیا ہے اور جس کی جڑیں ہماری زندگی تک نہیں پہونچی ہیں اس کا ہر جوڑ کیلوں سے جڑا ہوا ہے اور یہ اُسی وقت تک قائم ہے جب تک کہ ایک کیل دوسری کیل کو تقویت پہونچا رہی ہے۔ یہی اس کی مضبوطی ہے

اور (ہماری خوش قسمتی سے) یہی اس کی کمزوری ہے کیونکہ جب ایسا نظام ٹوٹنا شروع ہوتا ہے تو سارا ڈھانچہ یکایک بتاسے کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔

پچھلے سال قید خانے سے میں نے ہوم ممبر صاحب کو یہ لکھنے کی جرات کی تھی کہ یو۔پی کے جیل خانوں کا جو وسیع تجربہ مجھے گذشتہ بارہ سالوں میں ہوا ہے اُس کی بناء پر میں نہایت افسوس کے ساتھ اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ ہمارے صوبے کے جیل خانے ہر قسم کی زیادتی، بے ایمانی اور آلودگی کے مرکز ہیں۔ کئی سال ہوئے میں نے چند بدعنوانیاں اپنے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو بتائی تھیں (وہ بعد کو انسپکٹر جنرل ہو گئے تھے)۔ انھوں نے یہ بدعنوانیاں تسلیم کیں اور یہ بھی کہا کہ جب پہلے پہل وہ جیل خانے کے محکمہ میں آئے تھے تو اُن کے دل میں بھی اصلاحی جوش تھا لیکن جب بعد کو انھوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ اکیلے ان کی روک تھام کرنے سے قاصر ہیں تو انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ جو ہوتا ہے ہونے دیں اور کوئی دخل نہ دیں۔

دراصل بہترین افراد بھی تن تنہا کچھ نہیں کر سکتے اور جن لوگوں کے سپرد یہ کام ہے ان میں سے زیادہ تر لوگ بہترین افراد کی نمایاں مثال کے طور پر پیش نہیں کئے جا سکتے۔ ہندوستانی جیل بھی تو آخر کار اس بڑے بیرونی ہندوستان ہی کی ایک چھوٹی سی تصویر ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ مقصد کیا ہے؟ انسانی بہبودی یا محض ایک کل کو رواں رکھنا۔ یا

اہلِ غرض کے حقوق کی پاسداری ؟ سزائیں کس غرض سے دی جاتی ہیں ؟ حکومت اور تمدن کی طرف سے محض انتقام لینا یا غلطی کرنے والے کو سدھانا؟ کیا جج صاحبان اور جیل کے حکام کبھی یہ بھی سوچتے ہیں کہ جب بدقسمت کو جیل خانے بھیجا گیا ہے اس کو وہاں سے اس قابل بن کر نکلنا چاہیے کہ وہ معاشرت میں اپنی مناسب جگہ لے سکے ؟ ایسے سوال اٹھانا ہی غالباً گستاخی ہے کیونکہ دراصل کون ان باتوں کی طرف توجہ دیتا ہے ؟

ہمیں امید ہے کہ ہمارے جج صاحبان کے دلوں میں بھی کافی وسعت ہوگی۔ سزائیں تو یقیناً بڑی لمبی لمبی دیتے ہیں۔ پشاور سے ایسوسی ایٹڈ پریس (Associated Press) کی ایک خبر مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۳۲ء یہ آئی ہے۔ "کولڈ اسٹریم (Coldstream) کے قتل کے چند ہی روز بعد سرحدی صوبے کے انسپکٹر جنرل آف پولیس اور دیگر سربرآوردہ حکام کے نام دھمکیوں کے خط لکھنے کی بنا پر پشاور کے سٹی مجسٹریٹ نے مسمی جمنا داس ملزم کو حسب دفعات ۵۰۰ و ۵۰۷ تعزیرات ہند آٹھ سال قید سخت کی سزا دی" یہ جمنا داس غالباً ایک کم عمر لڑکا تھا۔

دوسری حیرت انگیز مثال لیجئے۔ یہ بھی ایسوسی ایٹڈ پریس کی خبر ہے اور لاہور سے ۲۲ اپریل ۱۹۳۳ء کو دی گئی ہے۔ "حسب دفعہ ۱۹ قانون اسلحہ ایک نوجوان مسلمان مسمی سعادت کو سٹی مجسٹریٹ نے اٹھارہ مہینے کی قید سخت دی۔

اس کے پاس سے ایک چاقو برآمد ہوا تھا جس کا پھل سات انچ لمبا تھا۔"

تیسری مثال مدراس کی لیجئے۔ یہ خبر ۶ جولائی ۱۹۳۳ء کو موصول ہوئی تھی۔ ایک لڑکے مسمی راما سوامی نے چیف پریزیڈنسی مجسٹریٹ کے اجلاس پر جبکہ وہ ایک سازش کا مقدمہ سننے میں مصروف تھے ایک معمولی پٹاخہ چھوڑ دیا۔ راما سوامی کو چار سال کی قید سخت دی گئی اور وہ بظاہر نابالغوں کے جیل میں رکھا گیا۔

یہ تین غیر معمولی مثالیں نہیں ہیں۔ ان کی تعداد بہت آسانی سے بڑھائی جا سکتی ہے اور ان سے بھی زیادہ دردناک مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان والے مصیبت سہنے کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ ایسی عجیب و غریب سزائیں سُن کر بھی ان کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ باوجود اس کے کہ میں نے برداشت کرنے کی بہت کچھ عادت ڈالی ہے پھر بھی ایسی سزاؤں کو سُن کر میرا دم رُکنے لگتا ہے۔ اگر ایسی سزائیں جرمنی کی نازی حکومت کے علاوہ کہیں اور دی جائیں تو یقیناً ایک زبردست شورش کھڑی ہو جائے۔

اور انصاف ہندوستان میں پورے طور پر اندھا بھی نہیں ہے۔ اس کی ایک آنکھ ہمیشہ کھُلی رہتی ہے۔ زمینداری کے ہر جھگڑے یا بلوے میں کافی کسانوں کو کالے پانی کی سزا دی جاتی ہے۔ عام طور پر یہ بلوے اُس وقت ہوتے ہیں جبکہ بیچارے کسان زمینداروں کے کارندوں کے

پیہم تشدد کی وجہ سے بالکل عاجز آجاتے ہیں اور اُن کی پریشانی اُن کی برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔ جن لوگوں کی موقع پر موجودگی ہو سکتی تھی ان سب کو نامزد کر دینا یا ان کی شناخت کر لینا ان کو لمبی لمبی سزائیں کرا دینے کے لئے بہت کافی ہے اور ایک نہایت آسان طریقہ ہے۔ عام طور پر اس طرف کوئی توجہ کبھی نہیں کی جاتی کہ ان کو کیا اشتعال دیا گیا تھا اور شناخت بھی اکثر نہایت کمزور قسم کی ہوتی ہے۔ کسی ایسے شخص کو پھنسا دینا جس کے خلاف تھانہ دار صاحب کی تیوری بدل چکی ہو کوئی مشکل بات نہیں۔ اور اگر اس معاملہ کو کوئی سیاسی رنگ دیا جا سکے (مثلاً لگان نہ دینے کی تحریک) تو اس سے زیادہ آسان طریقہ سزایاب کرانے کا نہیں اور ملزم کو سخت سے سخت سزا ملنا یقینی ہے۔

حال میں ایک کسان کو ایک ٹیکس وصول کرنے والے کو طمانچہ مارنے پر ایک سال کی سزا دی گئی تھی۔ ایک دوسری مثال لیجئے مگر یہ ذرا مختلف ہے یہ میرٹھ کا پچھلی جولائی کا واقعہ ہے۔ ایک نائب تحصیلدار صاحب کسی گاؤں میں آبپاشی کا لگان وصول کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ چپراسی ایک کسان کو تحصیلدار صاحب کے سامنے گھسیٹتے ہوئے لائے اور یہ شکایت کی اس کے بیوی بچوں نے اُن کو مارا ہے۔ (یہ ذرا مشکل سے یقین آنے والی بات ہے) اس پر نائب صاحب نے یہ حکم دیا کہ بیوی کی خطا پر اس کو

سزا دی جائے اور تینوں آدمیوں نے یعنی نائب صاحب خود اور دونوں چپراسیوں نے مل کر اُس کی اچھی طرح مرمّت کی اور خوب لاٹھیوں سے مارا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیچارہ کچھ روز بعد مر گیا۔ نائب صاحب اور دونوں چپراسیوں پر مقدمہ چلایا گیا لیکن محض ضرب خفیف پہونچانے کے مجرم قرار دئے گئے لیکن پھر بھی کوئی سزا نہ دی گئی بلکہ چھ مہینے تک نیک چلنی سے بسر کرنے کا وعدہ کرنے پر فوراً چھوڑ دئے گئے۔ نیک چلنی سے غالباً یہی مراد تھی کہ اس چھ مہینے میں کسی اور کو اس طرح نہ ماریں کہ وہ ہلاک ہو جائے۔ ان دونوں مثالوں کا مقابلہ کرنا کافی سبق آموز ہے۔

لہذا جیل خانوں کی اصلاح کے سوال اٹھانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ضابطۂ فوجداری کی ترمیم کی جائے اور اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہمارے ججوں کا دماغ تبدیل کیا جائے جو ابھی تک سَو سال پُرانی ذہنیت رکھتے ہیں اور جو اس بات سے قطعی طور پر ناواقف اور بے خبر ہیں کہ دنیا اب اس خیال کی ہو چکی ہے کہ سزا محض مجرم کی اصلاح کے لئے دینی چاہئے۔ یہ پھر گھوم پھر کر ہم کو اس مقام پر لے آتا ہے کہ ہماری حکومت کا سارا کا سارا نظام تبدیل ہونے کے قابل ہے۔

لیکن اس مضمون میں ہمیں صرف جیل خانوں ہی سے بحث ہے۔ کوئی بھی اصلاح ہو وہ اسی نیت سے ہونی چاہئے کہ قیدی سُدھارا جائے اور

وہ ایک نیک باشندہ بن سکے نہ یہ کہ محض اس سے انتقام لیا جائے (میں یہاں سیاسی قیدیوں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں کیونکہ حکومت کی نظر میں ان میں سے اکثر تو اس قدر گمراہ ہو چکے ہیں کہ ان کے اصلاح پذیر ہونے کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے)۔ اگر ایک دفعہ یہ مقصد تسلیم کر لیا جائے تو آپ سے آپ سارے نظام میں ایک تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔ بالفعل تو جیل خانوں کے حکام میں شاذ و نادر ہی ایسے ہوں گے جن کے ذہن میں بھی یہ بات آتی ہو۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ ہمارے صوبہ کی پرانی جیل مینول (Jail Manual) میں ایک فقرہ اس مضمون کا تھا کہ قیدی سے محنت کرانے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ کوئی مفید یا کار آمد کام کرے بلکہ ایسا کام لیا جائے جس سے اس کو تکلیف پہونچے۔ یہ بتانے کے لئے کہ سزا کا مقصد کیا نہ ہونا چاہیے اس سے بہتر جملہ نہیں مل سکتا ہے۔ جیل کے قوانین کی نئی کتابوں سے یہ جملہ تو نکال دیا گیا ہے لیکن وہ بے درد اور ظالم ذہنیت جو اس جملہ سے ظاہر ہوتی ہے اور جس کو انسانیت کی ہوا بھی نہیں لگی ہے وہ ابھی پورے طور پر موجود ہے۔ اس کتاب میں قیدیوں کے جرائم کی ایک عجیب و غریب لمبی چوڑی فہرست ہے۔ انسانی عقل زندگی کو ناقابل برداشت بنانے کے لئے جتنی باتیں بھی سوچ سکتی ہے وہ سب اس میں درج ہیں۔ بولنا، گانا، ہنسنا، غیر معینہ اوقات پر ضروریات رفع کرنے کے لئے جانا۔ کھانا نہ کھانا وغیرہ وغیرہ ان سب کا شمار

جرائم میں ہے۔ ایسی صورت میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جیل خانے کے عملہ کا سارا وقت اسی میں صرف ہو جاتا ہے کہ قیدیوں پر دباؤ ڈالیں اور ان کو ان سیکڑوں قواعد کی خلاف ورزی سے باز رکھیں۔

ناواقف لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر سزا کافی سخت نہ دی جائے تو جرائم پیشہ گروہ بہت خیرہ ہو جائے گا اور اس طرح جرائم کی تعداد بہت بڑھ جائے گی۔ دراصل یہ بات حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ ایک صدی پیشتر انگلستان میں معمولی چوری پر پھانسی کی سزا دی جاتی تھی۔ جس وقت یہ تجویز پیش کی گئی کہ چوروں کو سزائے موت نہ دی جایا کرے تو ایک بڑی زبردست شورش مچی اور ہاؤس آف لارڈز (House of Lords) میں یہ بھی کہا گیا کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ڈاکوؤں کا راج ہو جائے گا اور کسی کا مال محفوظ نہ رہے گا۔ لیکن اس اصلاح کا نتیجہ بالکل برعکس نکلا اور جرائم کم ہو گئے۔ انگلستان اور دیگر ممالک میں جتنا کہ تعزیرات اور جیل کے قوانین کو نرم کرتے گئے اُسی قدر جرائم کم ہوتے گئے۔ انگلستان کے بہت سے پُرانے قید خانے چونکہ اب خالی ہیں لہٰذا دوسرے کاموں میں لائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں برخلاف اس کے جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے جیل خانوں کی آبادی (سیاسی قیدیوں کو نکال کے) روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اس اضافہ میں ہمارے حکام اور ججوں نے لمبی لمبی اور وحشیانہ سزائیں دے کر

بہت کچھ مدد دی ہے ۔ تمام دنیا اس بات پر متفق ہے کہ نوجوانوں کو اخلاقی طور پر تباہ و برباد کرنے کے لئے قید خانے سے بدتر کوئی جگہ نہیں اور جہاں تک ممکن ہو انھیں اس سے بچانا چاہئے ۔ لیکن ہندوستان کے جیل خانے لڑکوں اور نوجوانوں سے بھرے ہوئے ہیں اور اکثر اُن کو کوڑے بھی مارے جاتے ہیں ۔

دوسری غلطی لوگوں کی یہ ہے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر جیل خانوں کی حالت بہتر کی گئی تو مجرم ٹوٹ پڑیں گے ۔ یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ وہ لوگ انسانی فطرت سے بالکل ناواقف ہیں ۔ جیل خانہ چاہے کتنا بھی اچھا کیوں نہ ہو لیکن کوئی شخص خوشی سے قید میں رہنا نہیں چاہتا ۔ اپنا گھر بار چھوڑنا ۔ اپنی زندگی کی معمولی دلچسپیوں سے کنارہ کش ہونا ۔ اپنے بیوی ، بچوں اور دوستوں سے جُدا ہونا اور اپنی آزادی کھو دینا کوئی معمولی بات نہیں بلکہ ایک سخت مصیبت ہے ۔ یہ بات تو سب کو بخوبی معلوم ہے کہ ہندوستانی کسان اپنی آبائی زمین پر رہ کر فاقہ کرنا پسند کرتا ہے لیکن کسی دوسرے گاؤں میں جاکر اپنی فاقہ مستی دُور کرنے کی کوشش نہیں کرتا ۔ جیل خانوں کی حالت بہتر کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ قیدیوں کو آسائش کی زندگی بسر کرنے کی اجازت دی جائے ۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان معاملات میں انسانیت اور عقل سے کام لیا جائے ۔ قیدیوں سے سخت محنت ضرور لی جائے لیکن یہ

وحشیانہ اصولوں کے ماتحت نہ ہو اور بیکار کاموں میں ضائع نہ کی جائے۔ جیل خانوں میں جو چیزیں بنیں وہ یا تو ایسے کارخانوں میں بننا چاہئیں جہاں قیدیوں کی محنت سے بڑے پیمانہ پر اشیا بن سکیں یا جو گاؤں والوں کی صنعت کا نمونہ ہوں۔ جو کچھ محنت لی جائے اُس سے جیل اور قیدی دونوں کو فائدہ پہونچے اور جیل خانے میں رہنے کا خرچہ کاٹ کر قیدی کو اُس کے کام کے بازار کے نرخ پر دام دے جائیں۔ دن میں آٹھ گھنٹہ کی سخت محنت کے بعد قیدیوں کو اس بات کی ترغیب دینی چاہیے کہ وہ ایک دوسرے سے ملیں اور مختلف مشاغل (مثلاً کھیل، تماشا، ورزش، لکچر، کتب بینی وغیرہ) میں ساتھ ساتھ حصہ لیں۔ سب میں زیادہ اس بات کی کوشش کرنا چاہیے کہ وہ ہنسیں بولیں اور ایک دوسرے سے و نیز جیل کے عملہ سے ایسے تعلقات پیدا کریں جس کی بنا انسانیت اور ہمدردی پر ہو۔ ہر قیدی کو تعلیم کی طرف خاص توجہ دینا چاہیے اور محض الف ب پڑھ لینا یا اپنا دستخط کر لینا کافی نہ سمجھا جائے بلکہ جہاں کہیں بھی ممکن ہو اس سے زیادہ پڑھانے کی کوشش کی جائے۔ قیدی کے دماغ کو بھی تربیت ملنی چاہیے اور جیل کے کتب خانوں میں اچھی کتابوں کا کافی ذخیرہ ہونا چاہیے جن کو وہ آزادانہ طور پر پڑھ سکے۔ اور جب چاہے اپنے نام نکلوا سکے۔ پڑھنے لکھنے کی طرف ہر قیدی کو راغب کرنا چاہیے اور ہر ایک کو کتابیں اور لکھنے کا سامان اپنے پاس رکھنے کی

اجازت ہونا چاہیے۔ قیدی کے لئے اس سے زیادہ مضر کوئی چیز نہیں ہے کہ وہ بارہ۱۲ چودہ۱۴ گھنٹے تک برابر اپنی تنگ اور اندھیری کوٹھری میں بغیر کسی کام کے بند پڑا رہے۔ اس کے لئے چھٹی ملنا اور ایک آفت ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس کے بند رہنے کی میعاد اور بڑھ گئی۔

چند چنے ہوئے اخبار بھی قیدی کے ہاتھ تک پہونچنا لازمی ہیں تاکہ بیرونی دنیا سے اس کا رشتہ قائم رہے اور خطوط لکھنے اور ملاقاتیں کرنے میں جہاں تک ممکن ہو کوئی روک ٹوک نہ کی جائے۔ میرے نزدیک تو ہر ہفتہ ان باتوں کی اجازت ملنا چاہیے۔ قیدی کو اس بات کا احساس دلانا چاہیے کہ اس کو بھی انسان سمجھا جا رہا ہے اور جابرانہ اور ذلیل کرنے والی سزائیں دینے سے مطلقاً پرہیز کرنا چاہیے۔

ہندوستان کے جیل خانوں کی موجودہ حالت دیکھتے ہوئے یہ سب خواب کی سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن میں نے صرف انھیں باتوں کا ذکر کیا ہے جو اکثر ترقی یافتہ ملکوں کے جیل خانوں میں بالفعل رائج ہیں۔ دراصل وہاں اس سے بھی زیادہ قیدیوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ مگر ہمارے موجودہ نظام کو بلکہ خود ہماری حکومت کو نہ تو ان باتوں کا احساس ہے نہ وہ انھیں سمجھ سکتی ہے کیونکہ اُس نے اپنے دل و دماغ کو کامیابی کے ساتھ پُرانی رسم اور خشک دستور کے تیرہ و تار حجروں میں بند کر دیا ہے۔ تاہم پبلک کے لئے

لازمی ہے کہ وہ ان تغیرات کے لئے اپنی آواز بلند کرے تاکہ جب وقت آئے ان کو عملی طور پر رائج کرنے میں دقت نہ ہو۔

یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ ان تبدیلیوں کی وجہ سے کوئی خاص خرچہ بڑھ جائے گا۔ اگر جیل خانے جدید صنعتی اصولوں پر باقاعدہ چلائے جائیں تو ان تمام مجوزہ تبدیلیوں کا خرچہ برداشت کرنے کے بعد بھی کچھ منافع ہی بچ رہے گا۔ ان تبدیلیوں کو رائج کرنے میں اگر کوئی مشکل ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اس کے لئے ایک قابل اور مستعد عملہ ضروری ہے جس میں انسانیت ہو جو نئے نقطۂ نظر کو بخوبی سمجھتا ہو اور اس سے ہمدردی رکھتا ہو اور جو اسے کامیاب بنانے کے لئے دل سے آرزومند ہو۔

میں چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن اس مسئلہ پر اچھی طرح غور کریں اور جہاں کہیں ممکن ہو دوسرے ملکوں کے جیل خانوں کا معائنہ کریں۔ ان کو فوراً خود معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے جیل خانے ان ملکوں کے جیل خانوں کے مقابلہ میں کتنے پیچھے ہیں۔ ہر جگہ کے برتاؤ میں وہ یہ محسوس کریں گے کہ انسانیت کا عنصر بڑھتا جا رہا ہے اور یہ تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ جرم معاشرتی اور تمدنی کشاکش کا نتیجہ ہے اور مجرم دراصل ایک مریض ہے جس کو سزا کے مقابلہ میں علاج کی زیادہ ضرورت ہے۔ اصلی مجرموں کی ذہنیت قریب قریب بچّوں کی سی ہوتی ہے اور ان کو صاحب عقل و شعور سمجھنا غلطی ہے۔

سیمول بٹلر (Samuel Butler) کی دلچسپ کتاب اردھان (Erewhon) میں اس نکتہ پر عرصہ ہوا کہ مزاحیہ طور پر زور دیا گیا تھا۔

چھوٹے سے ملک لیٹویا (Latvia) کے جیل خانوں میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ "ہر امکانی کوشش کی جاتی ہے کہ گھر کی سی فضا پیدا ہو اور قیدیوں کی کوٹھریوں میں پھول، پودے، کتابیں یا اُن کا ذاتی سامان مثلاً تصویریں۔ وائرلس سٹیز (Wireless Sets) یا دیگر چھوٹی چھوٹی آرائش کی چیزیں سجادی جاتی ہیں"۔ قیدیوں کو محنت کی اُجرت دی جاتی ہے جس میں سے کہ آدھی ان کو فالتو خرچ (مثلاً اخبار، تمباکو، یا کوئی خاص کھانے کی چیز وغیرہ) کے لئے دے دی جاتی ہے اور آدھی اُن کے حساب میں جمع ہو جاتی ہے۔

روس (سوویٹ کی وہ خطرناک سرزمین) غالباً جیل خانوں کی اصلاح میں سب سے آگے بڑھ گیا ہے۔ حال ہی میں ایک ایسے معتبر شخص نے سوویٹ کے جیل خانوں کا معائنہ کیا تھا جس کی نظر پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے اور جس کی رپورٹ نہایت دلچسپ ہے۔ یہ معائنہ کرنے والے ڈی' ان' پرٹ' کے' سی (D.N. Pritt. K.C.) تھے جو انگلستان کے ایک مشہور و معروف بیرسٹر ہیں اور جو ہاورڈ لیگ (Howard League) کے صدر بھی ہیں۔ اس انجمن کا خاص مقصد تعزیری اصلاح ہے اور پچھلے

ساٹھ سال میں اسی سلسلہ میں اس نے انگلستان میں سب میں زیادہ رہنمائی کی ہے اور نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ہیرٹ نے یہ رپورٹ دی ہے کہ روس میں سزا کا تنبیہی پہلو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے اور محض اس کے اصلاحی پہلو پر زور دیا جاتا ہے۔ قیدیوں کے ساتھ حیرت انگیز نرمی اور انسانیت سے سلوک کیا جاتا ہے۔

دو قسم کے قید خانے ہیں۔ (۱) پورے طور پر کھلی ہوئی بستیاں یا نیم کشادہ قیام گاہیں۔ ان کو در اصل جیل خانے نہ کہنا چاہیے کیونکہ یہاں قیدی محض چند پابندیوں کے ساتھ معمولی گاؤں والوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ (۲) بند جیل خانے۔ یہ زندانوں میں سخت ترین سمجھے جاتے ہیں لیکن یہاں بھی قیدیوں کو حیرت انگیز آزادی حاصل ہے۔ نگہبانوں اور قیدیوں میں خوشگوار تعلقات ہیں اور برابر والوں کی طرح ملتے ہیں اور کام کے اوقات چھوڑ کر آپس میں ملنے یا بات چیت کرنے کی کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ دن میں آٹھ گھنٹے عام کارخانوں کی طرح یہاں بھی کام لیا جاتا ہے اور مناسب اجرت دی جاتی ہے۔ باقی وقت کھیل کود۔ جسمانی ورزش۔ لکچر۔ تعلیم یا اُن ناٹکوں کے دیکھنے میں گزرتا ہے جن میں قیدی خود حصہ لیتے ہیں۔ قیدی ایک اخبار بھی نکالتے ہیں جو کہ دیواروں پر چپکا دیا جاتا ہے اور وہ اس میں جیل خانے کے عملہ پر اگر ضرورت ہوتی ہے تو یہ اعتراض بھی

کرتے ہیں کہ وہ بھول گئے ہیں کہ جیل خانہ مقام تنبیہ نہیں ہے بلکہ جائے اصلاح۔

خود اطاعتی کے اصول جن کو روس کے ہر نظام میں جاری کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کسی حد تک جیل خانوں میں بھی رائج ہیں اور قیدی اپنے لئے خود سزائیں تجویز کرتے ہیں۔ کام کے اوقات چھوڑ کر تمباکو پینے کی پوری اجازت ہے۔ خط و کتابت پر قریب قریب کوئی روک ٹوک نہیں ہے اور کافی ملاقاتوں کی اجازت ہے۔ اور سب میں زیادہ حیرت انگیز قاعدہ یہ ہے کہ قیدی کو گرمیوں میں پندرہ روز کی چھٹی دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے گھر ہو آئے اور اپنی فصل وغیرہ دیکھ آئے۔ عورت قیدی جس کی گود میں بچہ ہو اُس کو اختیار ہے کہ چاہے وہ اس بچہ کو جیل خانے کے پرورش خانے میں رکھے یا اُسے گھر پر چھوڑ آئے۔ اگر وہ اُسے گھر پر چھوڑ آئی ہے تو اسے اپنے بچہ کو دودھ پلانے کے لئے گھر جانے کی دن میں کئی بار اجازت دی جاتی ہے۔

جیل خانوں کی کوٹھریوں میں پھول پودے اور تصویریں بھی موجود تھیں۔ قیدیوں کو برابر دل و دماغ کے ماہرین یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ ان کی ذہنی حالت قابل اطمینان ہے معائنہ کرتے رہتے تھے۔ جب کبھی ضروری ہوتا تھا قیدیوں کو علاج کے لئے دماغی اسپتالوں میں رکھا جاتا تھا۔ قید تنہائی شاذ و نادر ہی دی جاتی تھی۔

یہ باتیں قابلِ یقین نہیں۔ تاہم دنیا میں یہ ہو رہی ہیں اور ان کے نتائج حیرت انگیز طور پر اچھے ثابت ہو رہے ہیں۔ روس والے یہ اُمید کرتے ہیں کہ رفتہ رفتہ جرائم اتنے کم ہو جائیں گے کہ ان کو اپنے بہت سے جیل خانے بند کر دینا پڑیں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اچھا سلوک بجائے جیل خانے بھرنے کے اُنھیں خالی کرتا ہے بشرطیکہ اقتصادی پس منظر موافق ہو اور کام ملنے میں دقت نہ ہو۔

کچھ عرصہ ہوا ہاؤس آف کامنز (House of Cammons) میں ہندوستان کے جانوروں کی حفاظت کا مسئلہ زیرِ غور تھا۔ یہ مقصد قابلِ تعریف ضرور ہے لیکن غالباً یہ یاد رکھنا بھی مناسب نہیں ہے کہ ہندوستان کے دو ٹانگ والے جانوروں کو بھی حفاظت اور نگہداشت کی ضرورت ہے۔ خصوصاً وہ بدنصیب جو جیل خانوں کی لمبی لمبی سزائیں بھگتنے اور سخت سے سخت جسمانی اور دماغی تکالیف سہنے کے بعد ناکارہ ہو کر اور معمولی زندگی میں حصہ لینے کی صلاحیت کھو کر باہر نکلتے ہیں۔

ناروے کے جیل خانوں کی ہر کوٹھری کی دیواروں پر یہ کتبہ لکھا ہوا ہے۔ یہ ایک مشہور ناروجین (Norwegiam) قیدی کی تقریر کا ایک ٹکڑا ہے جس کو نشہ کی حالت میں چوری کرنے پر لمبی سزا بھگتنی پڑی تھی اور جو بعد کو ہندوستان بھی آیا تھا اور یہاں اسکینڈ نیوین سنتال مشن

(Scandinavian Santal Mission) کی بنا ڈالی تھی۔ وہ بعد کو بہت سی زبانیں سیکھ گیا تھا اور نئی اور پرانی ملا کر سترہ زبانیں جانتا تھا جس میں سنتالی زبان بھی تھی۔ وہ ٹکڑا حسب ذیل ہے۔

"قیدی کے احساسات کو کوئی شخص جب تک کہ وہ خود کسی وقت قید میں نہ رہا ہو نہیں سمجھ سکتا۔ زائد سے زائد اس کا ایک اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن یہ اس رنجیدہ اور مایوس انسان کے جذبات کا جس کو دنیا بھول گئی ہے اور جو اکیلا اپنی تاریک کوٹھری میں بیٹھا ہے نہ تو آئینہ ہو سکتا ہے اور نہ اس کی خاموش زبان کا ترجمان"۔

کاش وہ لوگ جن کو قسمت نے ان کوٹھریوں سے باہر رکھا ہے کبھی بھول کر اس بے زبان حسرت نصیب کے بارے میں بھی کچھ سوچ لیا کریں۔

۱۹۳۴ء

زبان کا مسئلہ

[یہ ترجمہ جناب صلاح الدین احمد صاحب کا کیا ہوا ہے۔ اور ۱۹۳۷ء میں "ادبی دنیا" کے ستمبر کے نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ چونکہ میرے لئے اس مضمون کا اس سے بہتر ترجمہ کرنا ممکن نہ تھا لہٰذا ان کی اجازت سے اس مجموعہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔ میں مترجم موصوف کا دل سے شکر گذار ہوں کہ انھوں نے مجھے یہ اجازت عطا فرمائی۔]

گذشتہ چند ماہ سے ہندی اور اُردو کا پُرانا قضیہ ازسرِ نو تازہ ہو گیا ہے اور دونوں جانب سے نہایت جوش و خروش کے ساتھ الزامات اور جوابی الزامات کا سلسلہ جاری ہے۔ افسوس ہے کہ ایسے مسئلے کو جو اپنے حل کے لئے ایک پُر سکون علمی فضا عالمانہ غور و خوض اور علمی بحث کا محتاج تھا۔ بازاری شور و غوغا میں گھسیٹ لایا گیا ہے اور فرقہ وارانہ ہنگامہ آرائیوں کا مرکز بنا دیا گیا ہے اور پھر اس اکھاڑے میں جو پہلوان کودے ہیں۔

انھیں یقینی طور پر نہ اپنی زبان سے کوئی لگاؤ ہے اور نہ اس کی ادبیات سے کوئی دلچسپی۔ انھیں تو فقط سرکار کے احکام اور عدالت کے ضابطوں سے مطلب رہا ہے۔ پس وہ لوگ جو زبان سے اس لئے اُلفت کرتے ہیں کہ زبان تہذیب و تمدن کا پیکر۔ لطیف خیالات کے طائر سبک پرواز کا دام رنگیں۔ نازک ترین احساسات اور جذبات کا ذریعۂ اظہار۔ شاہد معنی کا آئینہ۔ ادراک انسانی کے زیر و بم کا ارگن۔ الفاظ کی دلچسپ داستانوں اور دلکش بندشوں کا شیرازہ اور زندگی اور اس کی بوقلموں کیفیتوں کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ وہ لوگ جنھیں زبان ان خصوصیات اور ایسی دیگر صفات کے باعث عزیز ہے۔ وہ ہمیشہ ان بازاری جھگڑوں کو حیرانی کی نگاہوں سے دیکھا کئے اور اپنا دامن بچا کر علٰحدہ کھڑے رہے۔

بایں ہمہ ہم اس مسئلے کی طرف سے تغافل نہیں برت سکتے اور اس سے دُور بھی نہیں رہ سکتے کیونکہ زبان کا مسئلہ ہمارے لئے بہت اہم ہے۔ اس کی اہمیت محض بعض لوگوں کی جاہلانہ چیخ پکار پر مبنی نہیں کہ ہندُستان زبان کے معاملے میں بابل کا روایتی مینار ہے جس کے بسنے والے سیکڑوں بولیاں بولتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے اور ہر صاحب بصیرت پر یہ حقیقت عیاں ہے کہ ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک میں رقبہ کے لحاظ سے بہت کم زبانیں بولی جاتی ہیں اور یہ سب آپس میں بہت ملتی جُلتی ہیں۔ علاوہ بریں

ہندوستان میں ایک عالمگیر اور مقبول عام زبان بھی رائج ہے جس کے بولنے والوں کی تعداد دس بیس کروڑ سے کم نہیں۔ پھر بھی زبان کا مسئلہ پیچیدہ ہے اور ناخنِ گرہ کشا کا محتاج ہے۔

اس وقت ہمیں اس مسئلہ کی طرف اس کی متعلقہ سیاسی اور فرقہ وارانہ پیچیدگیوں کے باعث بھی متوجہ ہونا پڑے گا لیکن یہ ایک عارضی گذر جانے والی کیفیت ہے۔ اصل مسئلہ اس صورت میں باقی رہے گا کہ ہم تعلیم جمہور اور عوام کی تمدنی ترقی کے عام پروگرام میں زبان کے متعلق کیا طرزِ عمل اختیار کریں اور اپنی گوناگوں اور بیش قیمت روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ایک قومی اتحاد کی بنیادیں کس طرح استوار کریں۔

زبان کا مسئلہ کسی قوم کے لئے ہمیشہ بہت بڑے نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ اب سے پورے تین سو سال پہلے مشہور انگریزی شاعر ملٹن نے ایک خط میں جو اس نے فلورنس سے اپنے ایک دوست کو لکھا۔ اس اہمیت کی وضاحت یوں کی ہے:" یہ امر کچھ کم نتیجہ خیز نہیں ہے کہ ایک قوم کی زبان کیسی ہے۔ خالص یا خراب۔ یا وہ لوگ اسے عام طور پر کس حد تک صحت و صفائی سے بولتے ہیں۔ جس ملک کی زبان کے الفاظ بجائے خود کریہہ اور ناخوشگوار ہوں گے یا مسلسل غلط استعمال کے باعث ان کی شکل و صورت مسخ ہو گئی ہو گی۔ وہ نہایت واضح طور پر اس بات کا اعلان کریں گے کہ اس

ملک کے رہنے والے نہایت کاہل اور بے حس لوگ ہیں جن کے دماغ ہر قسم کی غلامی قبول کرنے کے لئے مدت سے تیار ہو چکے ہیں۔

اس کے برخلاف ہم نے یہ کبھی نہیں سُنا کہ کوئی ریاست یا سلطنت جب تک کہ اس نے اپنی زبان کو اپنی محبت اور حفاظت کے سائے میں رکھا۔ کم از کم ایک اوسط درجے کی ثروت و طاقت کی مالک نہ رہی ہو۔

(۲)

ایک زندہ زبان گویا ایک جیتا جاگتا جسم ہے جس کی رگوں میں زندگی کا خون ہر وقت رواں رہتا ہے۔ اور یہ بہ مصداق ؎

جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

ہر لحظہ بڑھتا، پھیلتا اور ان لوگوں کے خیالات و جذبات کی پیہم ترجمانی کرتا رہتا ہے جو اسے بولتے اور لکھتے ہیں۔ یا اسے ایک عمارت سمجھئے کہ جس کے وسیع زرّیں ایوانوں میں عوام آباد ہیں اور جس کا تنگ سہ منزلہ خواص کے تمدن کا حامل ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم منازل بالا سے احکام صادر کر کے یا ریزولیوشن پاس کر کے اس کی شکل و صورت اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کر دیں۔ لیکن میں اکثر اس عام خیال سے دوچار ہوا ہوں کہ اگر ہم چاہیں تو ایک زندہ زبان کو اپنی مرضی کے مطابق ایک خاص مسلک اختیار کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ دنیا کے جدید

حالات میں پریس، سینما، ریڈیو اور اشاعت کتب کی وساطت سے جمہور میں ایک عام پروپیگنڈا اور عام تعلیم کے وسیع الاثر ذرائع کو حرکت میں لاکر زبان میں گذشتہ زمانے کی بہ نسبت بہت جلد تبدیلیاں پیدا کی جاسکتی ہیں لیکن زبان کی یہ تبدیلیاں بھی ان بڑی تبدیلیوں کی آئینہ دار ہوں گی جو خود عوام کی ذہنیتوں میں رونما ہو رہی ہیں۔ جب کبھی کوئی زبان عوام سے اپنا رشتہ توڑتی ہے تو وہ ایک بے جان اور مصنوعی چیز ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اسے ایک زندہ طاقتور اور فرحاں وشاداں ہستی ہونا چاہیے۔ پس ایسی تمام کوششیں جو کسی زبان کو ایک خاص جانب ترقی دینے کے لئے کی جائیں گی۔ ہمیشہ اس کی صورت بگاڑنے اور اس کی روح کو کچلنے میں صرف ہوں گی۔

(۳)

زبان کے متعلق حکومت کی کیا پالیسی ہونی چاہیے۔ کانگریس نے اپنے "بنیادی حقوق" کے ریزولیوشن میں اسے مختصر طور پر لیکن نہایت صفائی اور وضاحت سے یوں بیان کیا ہے:" اقلیتوں اور مختلف لسانی رقبوں کے تمدن۔ زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائے گی۔" کانگریس اس اعلان کی پابند ہے اور کسی اقلیت یا لسانی مجموعے کو اس سے زیادہ اطمینان کی ضرورت نہیں۔ علاوہ بریں کانگریس نے اپنے دستور میں اور بہت سی

قراردادوں میں بار بار اعلان کیا ہے کہ اگرچہ ملک کی مشترکہ زبان ہندوستانی قرار دی جائے، لیکن صوبجاتی زبانوں کو اپنے اپنے حلقوں میں فوقیت حاصل ہونی چاہیے۔

کوئی زبان تجویزوں کے ذریعے سے ملک میں رائج نہیں کی جاسکتی۔ پس کانگریس کی یہ کوششیں کہ ایک طرف ملک میں ایک مقبول عام مشترکہ زبان پیدا کی جائے، اور دوسری جانب صوبجات میں مقامی زبانوں کو اظہار مطالب کا ذریعہ بنایا جائے، اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتیں اور عوام پر مطلق اثر انداز نہیں ہوسکتیں جب تک کہ وہ موجودہ حالات اور ضروریات کے مطابق نہ ہوں۔ پس ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ اس شرط کو کس حد تک پورا کرتی ہیں۔

(۴)

ہمارے بڑے بڑے صوبوں کی زبانیں محض بولیاں نہیں ہیں۔ انھیں بعض دفعہ محض جہالت سے ایسا سمجھا جاتا ہے۔ وہ قدیم زبانیں ہیں جنھیں تہذیب و تمدن کا معقول ورثہ ملا ہے۔ ان میں سے ہر زبان کو کروڑوں آدمی بولتے ہیں اور ہر زبان اپنے حلقے میں عوام اور خواص دونوں کے جذبات و خیالات زندگی اور تمدن کے ساتھ نہایت مضبوطی سے وابستہ ہے۔ یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ عوام کی تعلیمی اور تمدنی ترقی ان کی اپنی زبان

ہی کے ذریعے سے ممکن ہو سکتی ہے۔

پس یہ ناگزیر ہے کہ ہم صوبجاتی زبانوں کی اہمیت پر زور دیں اور اپنا زیادہ تر کام انھیں سے نکالیں کسی اور زبان کا استعمال ہر جگہ وہاں کے مختصر تعلیم یافتہ طبقے کو لازماً عوام سے جدا کرنے اور ان کی ذہنی ترقی کو روک دینے کا باعث ہوگا۔ جب سے کانگریس نے اپنے کام کے لئے صوبجاتی زبانوں کی وساطت اختیار کی ہے۔ ہم نے عوام سے اپنے تعلقات بہت جلد مضبوط کر لئے ہیں اور ملک بھر میں کانگریس کی طاقت اور وقار میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ کانگریس کا پیغام ہر دور افتادہ جھونپڑی تک پہونچ گیا ہے اور عوام کا سیاسی شعور روز بروز بڑھ رہا ہے۔ پس یہ لازم ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام اور پبلک کاروبار کی بنیاد صوبجاتی زبانوں پر رکھی جائے۔

یہ زبانیں کون کون سی ہیں۔ اول ہندوستانی اپنی دونوں صورتوں یعنی اُردو اور ہندی اور اپنی مختلف بولیوں کے ساتھ۔ پھر بنگالی، مراٹھی اور گجراتی جو ہندی کی بہنیں ہیں اور اس سے ملتی جلتی ہیں، جنوب میں تامل، تلوگو، کناری اور ملیالم۔ ان کے علاوہ اڑیا، آسامی اور سندھی ہیں اور شمال مغرب میں پنجابی اور پشتو۔ یہ بارہ تیرہ زبانیں سارے ہندوستان پر حاوی ہیں ان میں سے ہندوستانی سب سے زیادہ وسیع الاثر ہے اور ایک لحاظ سے ملک بھر کے لئے مشترکہ زبان ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے۔

(۵)

صوبجاتی زبانوں کے مختلف دائروں میں مداخلت کئے بغیر ہمیں ہندوستان بھر کے لئے اظہار خیالات کے ایک مشترک ذریعہ کی بھی ضرورت ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کام انگریزی سے لیا جا سکتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ جہاں تک اونچے طبقے کی ضروریات اور ہندوستان کی مشترکہ سیاسی اغراض کا تعلق ہے۔ انگریزی سے ایک حد تک کام لیا جا چکا ہے۔ لیکن اگر ہم جمہور کا خیال کریں تو یہ نظریہ بالکل غلط ثابت ہو جائے گا۔ ہم کروڑوں انسانوں کو ایک بالکل پردیسی زبان میں تعلیم نہیں دے سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے گذشتہ تعلقات اور اپنی موجودہ عالمگیر اہمیت کے باعث انگریزی لازمی طور پر ہمارے لئے ایک بہت اہم زبان رہے گی۔ بیرونی دنیا سے رابطہ رکھنے میں ہمارے لئے یہ سب سے زیادہ اہم زبان ہو گی اگرچہ مجھے امید ہے کہ اس مطلب کے لئے بھی محض یہی زبان استعمال نہ کی جائے گی۔ میری رائے میں ہمیں دوسری غیر ملکی زبانیں مثلاً فرانسیسی، جرمن، روسی، اسپینی، اطالوی، چینی اور جاپانی بھی سیکھنا چاہئیں۔ بہرحال یہ طے شدہ ہے کہ انگریزی جمہور کے لئے ہندوستان کی مشترکہ زبان نہیں بن سکتی۔ یہ امتیاز ہندوستانی اور فقط ہندوستانی ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ جسے آج بارہ کروڑ انسان بولتے ہیں اور ان کے علاوہ کروڑوں پوری طرح نہیں تو

ایک بڑی حد تک سمجھ سکتے ہیں اور وہ لوگ جو ہندوستانی نہیں جانتے ۔کسی غیر ملکی زبان کے مقابلے میں اسے نہایت آسانی سے سیکھ سکتے ہیں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں بہت سے مشترک الفاظ ہیں ۔لیکن اس امر سے بہت زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان زبانوں کا تمدنی پس منظر بولنے والوں کے جذبات وخیالات اور لسانی میلانات ایک ہیں ۔ان وجوہ سے ایک ہندوستانی کے لئے ایک دوسری ہندوستانی زبان سیکھنا نسبتاً بہت آسان ہے ۔

(۶)

ہندوستانی کیا ہے ؟ ہم مبہم طور پر کہتے ہیں کہ یہ لفظ ہندی اور اُردو دونوں پر جیسا کہ یہ بولی اور علیحدہ علیحدہ لکھی جاتی ہیں ۔حاوی ہے اور ہم دونوں میں سے ایک درمیانی زبان نکالتے ہیں اور اس اپنی دریافت کردہ اوسط کا نام ہندوستانی رکھ دیتے ہیں ۔کیا یہ اوسط محض ایک خیال بے بنیاد ہے یا اس کے واقعے کچھ معنی بھی ہیں ؟

ہندوستانی کی جیسا کہ وہ شمالی اور وسطی ہندوستان کے مختلف حصوں میں بولی اور لکھی جاتی ہے ۔ بہت سی مختلف صورتیں ہیں جن سے کئی چھوٹی چھوٹی بولیاں پیدا ہوگئی ہیں ۔ مگر یہ تعلیم کی کمی کے لازمی نتائج ہیں اور جمہور میں تعلیم کے عام ہونے سے یہ غائب ہوجائیں گی اور صحت زبان کا ایک معیار قائم ہوجائے گا ۔

رہا رسم الخط - تو دیوناگری اور اُردو طرزِ تحریر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور اس بات کا قطعی کوئی امکان نہیں کہ ان میں سے ایک رسم الخط دوسرے کو جذب کرے گا اس لئے ہم نے یہ بہت اچھا فیصلہ کیا ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ قائم رہیں اور پھولیں پھلیں ۔ اس میں شک نہیں کہ اس صورت میں ان لوگوں پر جو دونوں زبانیں سیکھنا چاہیں گے ایک زائد بار پڑے گا اور ایک حد تک جُداگانہ ذہنیت کی حوصلہ افزائی بھی ہو گی ۔ لیکن ہمیں یہ قباحتیں برداشت ہی کرنی پڑیں گی کیونکہ اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے ۔ دونوں رسم الخط ہماری زبان کی مخصوص طبیعت کے حصے ہیں اور ان کے گرد نہ صرف ان سے مخصوص ادبیات جمع ہو گئی ہیں بلکہ جذبات کی ایسی زبردست فصیلیں کھنچ گئی ہیں جن کی شکست و ریخت ناممکن ہے ۔ میں نہیں جانتا کہ مستقبل بعید ہمارے لئے کیا کچھ لائے گا لیکن اس وقت تو دونوں کو جیوں کا تیوں رکھنا ہی پڑے گا ۔

زبان کے متعلق ہماری بعض مشکلات کے حل کے لئے لاطینی رسم الخط کی وکالت بھی کی گئی ہے ۔ تیز کام انجام دینے کے لحاظ سے یہ رسم الخط اپنے اندر بلاشبہ اُردو یا ہندی دونوں سے زیادہ قابلیت رکھتا ہے ٹائپ رائٹر ڈپلیکٹر (Duplicator) اور اس قسم کی دوسری مشینوں کے موجودہ دور میں لاطینی طرزِ تحریر کو ہندوستان کے رسوم الخط پر واقعی بہت فوقیت

حاصل ہے ۔ کیونکہ موخرالذکر ان ایجادات سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان فوائد کے باوجود لاطینی رسم الخط کے لئے اُردو یا دیونا گری کی جگہ لینے کا قطعاً کوئی امکان نہیں ۔ جذبات کا حصار تو ہے ہی اور اسے مزید تقویت اس بات سے پہونچتی ہے کہ لاطینی رسم الخط ہمارے غیرملکی فرماں رواؤں سے میل رکھتا ہے ۔ لیکن اس کے مستردِ کرنے کی اور مستحکم وجوہات بھی ہیں ۔ ہمارے رسوم الخط ہماری ادبیات کے لازمی حصے ہیں ۔ ان کے بغیر ہم اپنی قدیم روایات سے بالکل جُدا ہو جائیں گے ۔

یہ ضرور ممکن ہے کہ ہم اپنے رسوم الخط کی ایک حد تک اصلاح کرلیں ۔ ہندی اور اُردو کے علاوہ اس وقت بنگالی ، مرہٹی ، گجراتی ایسے رسوم الخط ہیں جو دیونا گری سے بہت ملتے جلتے ہیں ۔ یہ بہت آسانی سے ممکن ہے کہ ان چار زبانوں کے لئے ایک رسم الخط مقرر کردیا جائے اور ضروری نہیں کہ یہ موجودہ دیونا گری رسم الخط ہی ہو ۔ اس میں قدرے تبدیلی کی جاسکتی ہے ۔ مذکورۂ بالا چار زبانوں کے لئے ایک رسم الخط کا قرار پاجانا ان سب کے لئے مفید ثابت ہوگا اور انھیں ایک دوسرے سے قریب تر لے آئے گا ۔

مجھے معلوم نہیں کہ جنوب کی دراوڑی زبانوں کے طرز ہائے تحریر کی کسی شمالی رسم الخط سے مطابقت کہاں تک ممکن ہے یا وہ آپس میں

کس حد تک مربوط ہو سکتے ہیں ؟ جن اصحاب نے اس سوال پر غور کیا ہے وہ اس بارے میں ہماری رہبری کر سکتے ہیں ۔

اردو رسم الخط کو موجودہ صورت پر ہی قائم رکھنا ہوگا ۔ ہاں اسے کسی حد تک آسان تر بنانے کی کوشش کی جا سکتی ہے اور اس کے لئے بہت آسان ہے کہ سندھی رسم الخط کو جو اس سے بہت ملتا ہے اپنے میں جذب کرلے ۔

پس آگے چل کر ہمارے لئے دو رسوم الخط رہ جائیں گے ۔ ہندی، بنگالی، مرہٹی اور گجراتی کا مربوط رسم الخط اور اردو طرز تحریر اور اگر ضرورت ہو تو ایک جنوبی رسم الخط ۔ ان میں سے کسی ایک کو دبانے یا مٹانے کی ہرگز کوئی کوشش نہیں ہونی چاہئے ۔ سوائے ایسی صورت میں کہ اہل جنوب وشمال باہمی رضامندی سے جنوبی زبانوں کے رسم الخط کو ایک شمالی طرز تحریر کے مطابق کرلیں ۔ اور یہ طرز تحریر ہندی کی خفیف سی تبدیل شدہ صورت ہی ہو سکتی ہے ۔

(۷)

اب ہمیں ہندوستانی پر بحیثیت شمالی اور وسطی ہند کی مادری زبان کے اور بحیثیت ہندوستان کی مشترکہ زبان کے علیحدہ علیحدہ غور کرنا چاہئے ۔ کیونکہ یہ دونوں حیثیتیں ایک دوسرے سے جدا ہیں ۔

ہندی اور اُردو اس زبان کی دو بڑی صورتیں ہیں اور اس میں کلام نہیں کہ دونوں کی بنیاد - گرامر اور معمولی الفاظ کا ذخیرہ ایک ہی ہے اور دونوں درحقیقت ایک ہی بنیادی زبان ہیں - تاہم ان کے موجودہ اختلافات کچھ کم نہیں اور کہا جاتا ہے کہ ایک اپنا وجدان سنسکرت سے حاصل کرتی ہے اور دوسری کسی حد تک فارسی سے - ہندی کو ہندوؤں کی اور اُردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھنا حماقت ہے - اردو اپنے طرز تحریر کے سوا سراسر خاک ہند کی پیداوار ہے اور ہندوستان کے باہر اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں اور آج بھی شمالی ہند میں ہندوؤں کے بے شمار گھرانوں میں اردو ہی بولی جاتی ہے -

ہندوستان کے مسلم فرمانروا اپنے ساتھ فارسی لائے اور یہی ان کے درباروں کی سرکاری زبان قرار پائی اور اس کی یہ حیثیت مغل بادشاہوں کی حکومت کے آخر تک قائم رہی اس اثنا میں شمالی اور وسطی ہند کے جمہور کی زبان ہندی ہی رہی اور چونکہ یہ ایک زندہ زبان تھی اس نے فارسی کے بہت سے الفاظ اپنے میں جذب کر لئے - علیٰ ہذا گجراتی اور مرہٹی نے بھی کئے - لیکن اصلیت کے لحاظ سے ہندی ہندی ہی رہی - مغل دربار کے قرب وجوار میں ہندی کی ایک مبالغہ آمیز فارسی صورت رواج پا گئی جسے ریختہ کہتے تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لفظ اُردو مغل شہنشاہوں کے عہد میں مغل چھاؤنیوں میں رائج ہوا لیکن یہ ہندی کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا -

اس سے ہندی کی ایک ذرا مختلف صورت بھی مراد لی جاتی تھی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ تک اُردو کے معنی رسم الخط کو چھوڑ کر ہندی ہی سمجھے جاتے تھے اور جیسا کہ سب کو معلوم ہے۔ہندی کے بعض بہترین شاعر مسلمان ہوئے ہیں۔ اس ہنگامہ تک بلکہ اس سے کچھ بعد تک زبان کا نام ہندی ہی رائج تھا اس میں رسم الخط کی طرف کوئی اشارہ نہیں تھا بلکہ محض ملک ہند کی زبان مراد تھی مسلمان لکھنے والے بھی جو اُردو رسم الخط میں لکھتے تھے۔ اس زبان کو ہندی ہی کہتے تھے۔

یہ انیسویں صدی کے وسط کے آخر کا ذکر ہے کہ ہندی اور اُردو کے دو مختلف معنی لئے جانے لگے اور یہ اختلاف روز بروز بڑھتا گیا۔

غالباً پہلے پہل ہندوؤں نے قومیت کے روز افزوں احساس سے متاثر ہو کر خالص ہندی اور دیوناگری رسم الخط کے استعمال پر زور دینا شروع کیا۔ ان کے لئے قوم پرستی شروع میں لازمی طور پر ہندو قوم پرستی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد مسلمانوں میں بھی آہستہ آہستہ قومیت کے جذبات پیدا ہونے شروع ہوئے اور انھوں نے مسلم قوم پرستی کی شکل اختیار کر لی اور اس کی فضا میں اردو مسلمانوں کی مخصوص ملکیت تصور کی جانے لگی۔ اب رسم الخط کی بحث چھڑ گئی اور سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں اس کے استعمال پر کھینچا تانی شروع ہوگئی۔ پس زبان کی روز افزوں

تفریق اور رسوم الخط کی باہم آویزش سیاسی اور قومی شعور کی اس بیداری کے نتائج تھے جس نے پہلے پہل فرقہ پرستی کی صورت اختیار کی لیکن جیوں جیوں یہ فرقہ وارانہ قوم پرستی بھی قوم پرستی میں تبدیل ہوتی گئی اور لوگوں نے مسائل کو فرقہ داری کے زاویۂ نگاہ کی بجائے خالص ملکی نقطۂ نظر سے دیکھنا شروع کیا تیوں تیوں زبان میں علیحدگی کے رجحانات کو روکنے کی خواہش پیدا ہوتی گئی اور سمجھ دار لوگ اردو ہندی کی مشترک خوبیوں اور خصوصیتوں کو نمایاں کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ ہندوستانی کو نہ صرف شمالی اور وسطی ہند کی قومی زبان سمجھا جانے لگا بلکہ اسے ہندستان کی واحد مشترکہ زبان قرار دیے جانے کے تذکرے بھی شروع ہو گئے لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں ابھی فرقہ وارانہ ذہنیت کافی اثر رکھتی ہے۔ اس لئے ملک میں اتحاد لسانی کی خواہش کے ساتھ ساتھ علیحدگی کا رجحان بھی موجود ہے یہ بات یقینی ہے کہ یہ جداگانہ ذہنیت شعور قومیت کی پوری بیداری کے بعد غائب ہو جائے گی اور ہم پر نہایت وضاحت سے یہ حقیقت آشکار ہو جائے گی کہ اس خرابی کی اصل وجہ کیا ہے۔ اب بھی اگر آپ زبان کی علیحدگی کے کسی پرجوش حامی کا بیرونی رنگ و روغن اُڑا کر دیکھیں تو وہ حقیقت میں فرقہ پرست بلکہ اکثر اوقات سیاسی طور پر رجعت پسند نکلے گا۔

(۸)

اگرچہ مغل دور میں ایک طویل عرصہ تک اُردو ہندی کے الفاظ

ملایک معنی میں استعمال ہوتے رہے لیکن اُردو سے زیادہ تر وہ مخلوط زبان مراد لی جاتی ہے جو مغل چھاؤنیوں میں رائج تھی۔ شاہی دربار اور عسکری فرودگاہوں کے ارد گرد بہت سے فارسی الفاظ رائج تھے اور یہ اس زبان میں داخل ہوتے گئے۔ ہم جس قدر مغل درباری زندگی کے مرکزوں سے دُور دُور ہوتے ہوئے جنوب کی طرف بڑھتے ہیں۔ اُردو کو خالص ہندی میں سمویا ہوا پاتے ہیں۔ یہ ناگزیر تھا کہ دربار کا لسانی اثر دیہات کی بہ نسبت شہروں پر اور پھر جنوبی شہروں کی بہ نسبت شمالی شہروں پر بہت زیادہ ہوا۔

اور یہ نکتہ ہمیں اُردو ہندی کے موجودہ حقیقی فرق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اُردو شہروں کی زبان اور ہندی دیہات کی زبان ہے ہندی شہروں میں بھی بولی جاتی ہے لیکن اردو قریب قریب صرف ایک شہری زبان ہے۔ پس اُردو اور ہندی کو آپس میں قریب تر لانے کا مسئلہ درحقیقت گاؤں اور شہر کے باہمی اتصال کا اہم ترین مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ اختیار کرنا نہ صرف فضول ہوگا بلکہ ناپائدار ثابت ہوگا۔ زبانیں اپنی ہیئت اسی وقت بدلتی ہیں جب ان کو بولنے والے بھی بدل جاتے ہیں۔

(۹)

اگرچہ گھروں میں بولی جانے والی اُردو ہندی میں باہم چنداں فرق نہیں لیکن گذشتہ چند سال سے علمی و ادبی اُردو ہندی کی درمیانی خلیج بہت

وسیع ہوگئی ہے۔ ادبی تصنیفات میں یہ فرق بہت نمایاں ہے اور اس سے بعض لوگوں نے نتیجہ نکالا ہے کہ اس فرق کے پس پشت بدنیت لوگوں کے اغراض کام کررہے ہیں۔ یہ خیال کم فہمی پر مبنی ہے اگرچہ اس میں شک نہیں بعض افراد جدائی کے رجحان کو زیادہ کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں لیکن زندہ زبانیں اس طرح توڑی مروڑی نہیں جاسکتیں اور چند افراد ان پر اس قسم کی قدرت حاصل نہیں کرسکتے۔ اس ظاہری فرق کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے ہمیں زیادہ گہری نظر ڈالنا پڑے گی۔

یہ تفاوت اگرچہ بجائے خود قابل افسوس ہے لیکن حقیقت میں صحت مندانہ نشوونما کی علامت ہے۔ اُردو ہندی دونوں زبانیں سکون وجمود کے ایک لمبے وقفے کے بعد بیدار ہوئی ہیں اور آگے بڑھنے میں مصروف ہیں۔ وہ نئے نئے خیالات کو جامۂ اظہار پہنانے اور پرانی روشوں کو چھوڑ کر ادبیات میں جدید طرز بیان اور ادائے مطالب اختیار کرنے کے لئے جدوجہد کررہی ہیں۔

جہاں تک جدید تصورات کا تعلق ہے دونوں زبانوں کا ذاتی سرمایۂ الفاظ کم ہے لیکن دونوں کی دسترس میں سنسکرت اور فارسی کے دو بیش بہا معدن ہیں۔ اس لئے جیوں ہی کہ ہم گھر اور بازار کی عام زبان سے آگے بڑھ کر زیادہ لطیف حلقوں میں داخل ہوتے ہیں۔ دونوں زبانوں کا باہمی فرق نمایاں تر ہونے لگتا ہے۔ ادبی انجمنیں جنہیں اپنی اپنی زبانوں کی پاکیزگی کا

بہت خیال رہتا ہے - اس رجحان کو انتہا تک لے جاتی ہیں اور پھر ایک دوسرے پر جداگانہ میلانات کی حوصلہ افزائی کا الزام لگایا کرتی ہیں- اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتیں اور دوسرے کی آنکھ کا تنکا انھیں بہت آسانی سے نظر آجاتا ہے -

مذکورۂ بالا اسباب کا فوری نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہندی اور اردو کی درمیانی خلیج وسیع تر ہوتی جا رہی ہے اور بعض دفعہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا جُدا جُدا زبانیں بن جانا مقدر ہو چکا ہے تاہم یہ خوف بے بنیاد ہے اور گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں - ہمیں اس نئی زندگی کا خیر مقدم کرنا چاہیے - جو اردو اور ہندی دونوں کے پیکر میں سرائت کر رہی ہے - خواہ اس سے ان کا باہمی اختلاف عارضی طور پر زیادہ ہی کیوں نہ ہو رہا ہو- ہندی اور اردو دونوں اس وقت جدید علمی، سیاسی، معاشرتی، تجارتی اور بعض اوقات تمدنی تصورات کے موزوں اظہار کی پوری اہلیت نہیں رکھتیں دونوں زبانیں اپنا سرمایہ بڑھانے کی کامیاب جدوجہد میں مصروف ہیں تاکہ وہ دَور جدید کے سماج کی لسانی ضروریات پوری کرسکیں - پھر ایک دوسرے سے حسد کیوں کیا جائے۔ ہم اپنی زبان کو زیادہ سے زیادہ الفاظ کا سرمایہ دار دیکھنا چاہتے ہیں اور ایسا کبھی نہیں ہوسکتا اگر ہم ہندی یا اردو الفاظ کو اس وجہ سے مٹانے کی کوشش کرتے رہے کہ وہ ہمارے اپنے مخصوص پس منظر میں ٹھیک نہیں بیٹھتے

ہمیں دونوں کی ضرورت ہے اور ہمیں دونوں کو قبول کرنا ہوگا۔ ہمیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ ہندی کا فروغ اُردو کی ترقی سے مراد ہے۔ اور اُردو کی نشوونما ہندی کے پھلنے پھولنے سے عبارت ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر نہایت شدت سے اثر انداز ہوتی رہیں گی اور دونوں زبانوں کے الفاظ اور تصورات کے ذخیرے بڑھتے رہیں گے مگر لازم ہے کہ دونوں اپنے دروازے اور کھڑکیاں ان الفاظ اور تصورات کی آمد کے لئے پوری طرح کھلی رکھیں بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ ہندی اور اُردو دونوں غیر زبانوں کے الفاظ اور تصورات کو خوش آمدید کہیں اور انھیں اپنالیں۔ انگریزی یا فرانسیسی یا کسی اور غیر زبان کے ایسے الفاظ کے لئے جو آسان اور مقبول عام ہوں نئے سنسکرت اور فارسی الفاظ گڑھنا ایک احمقانہ بات ہے۔ میرے دل میں اس بات کے متعلق کوئی شک نہیں کہ اُردو اور ہندی کا ایک دوسرے سے قریب تر آنا ناگزیر ہے اور اگرچہ ان دونوں کے ظاہری لباس مختلف ہوں لیکن حقیقت میں وہ ایک زبان ہو کر رہیں گی۔ اس اتحاد کو ترقی دینے والی قوتیں انفرادی کوششوں کے روکے سے نہیں رک سکتیں۔ قوم پرستی کے جذبات اور ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کے قیام کی عالمگیر خواہش آخر میں فتحیاب ہو کر رہے گی۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ زمانہ کروٹ بدل چکا ہے۔ ہمارے سیاسی اور معاشرتی ماحول میں انقلاب برپا ہے آمد و رفت اور

نشر و اشاعت کے ذرائع بہت تیز اور وسیع ہو چکے ہیں اور ان کی مدد سے باہمی تبادلۂ خیالات اور میل جول میں آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ یہ سب اسباب مل کر زبان کے اتحاد پر یقیناً خوشگوار اثر ڈالیں گے۔ جب زمانے کا سیلِ رواں جوش و خروش سے گذر رہا ہو تو ہم تنگناؤں میں کیونکر چھپے رہیں گے۔ تعلیم جب عام ہو کر جمہور کو اپنے حلقے میں لائے گی تو اس میں یک جہتی اور ایک معیار کا قائم ہونا لازمی ہو جائے گا۔

(۱۰)

پس ہمیں اردو اور ہندی کے جداگانہ فروغ کو بھی شک و شبہ کی نظروں سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ اُردو کے حامیوں کو اس نئی روح کا خیر مقدم کرنا چاہیے جو ہندی میں سرائت کر رہی ہے اور ہندی کے عاشقوں کو بھی ان کوششوں کی داد دینی چاہیے جو اُردو کے بہی خواہ اُس کی ترقی کے لئے سر انجام دے رہے ہیں۔ دونوں فریق آج ایک دوسرے سے علٰحدہ متوازی طریقوں پر کام کئے جائیں اگرچہ کل ان کا ملنا ضروری ہے اور گو ہمیں اسی موجودہ جداگانہ روش کو رضامندی سے برداشت کر لینا چاہیے پھر بھی ہمیں دونوں کے اتحاد کے لئے اپنی کوشش جاری رکھنی چاہیے اس اتحاد کی بنیاد کس چیز پر رکھی جائے گی؟ یقیناً جمہور پر کیونکہ جمہور ہی کو اُردو ہندی کا مشترک عنصر قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہماری بہت سی موجودہ مشکلات کا

سبب وہ حد درجہ کی مصنوعی ادبی زبان ہے جس کا جمہور سے کوئی تعلق نہیں کبھی آپ نے سوچا کہ جب مصنفین لکھتے ہیں تو وہ کن کے لئے لکھتے ہیں۔ ہر مصنف کے ذہن میں شعوری یا نیم شعوری طور پر ایک ایسا حلقۂ سامعین ہوتا ہے جس پر وہ اپنے خیالات کا پرتو ڈالتا اور جسے اپنے نقطۂ نظر کا حامی بنانا چاہتا ہے۔ افسوس کہ ہماری عام جہالت کی وجہ سے یہ حلقہ ہمیشہ نہایت محدود رہا ہے لیکن پھر بھی یہ ہمارے مصنفین کے لئے کافی بڑا ہے اور روز بروز وسیع ہو رہا ہے۔

میں اس معاملے میں ایک ماہر کی حیثیت نہیں رکھتا لیکن میرا خیال ہے کہ ایک اوسط درجے کا ہندی یا اردو مصنف اس موجودہ حلقۂ سماعت سے بھی پوری طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتا وہ ان مخصوص ادبی مجالس کا زیادہ خیال رکھتا ہے جن سے اس کا روزمرہ کا تعلق ہوتا ہے اور وہ گویا ان ہی کے لئے ان کی پسندیدہ زبان میں لکھتا ہے اس کی آواز اور اس کے الفاظ جمہور کے وسیع تر طبقہ تک نہیں پہونچتے اور اگر پہونچتے بھی ہیں تو سمجھے نہیں جاتے۔ پھر اگر اردو اور ہندی کتابیں بہت کم فروخت ہوتی ہیں تو حیران ہونے کی کون سی بات ہے۔ ہمارے اردو اور ہندی اخبارات بھی عوام کے وسیع حلقے میں نہیں پہونچتے کیونکہ وہ عام طور پر بلند طبقے کی زبان استعمال کرتے ہیں۔

پس ہمارے مصنفین کو اپنے ذہن میں ایک جمہوری حلقہ تخاطب قائم کر کے ارادتاً عوام کے لئے لکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زبان خود بخود سہل ہو جائے گی اور مصنوعی اور آرائشی بندشیں جو ہمیشہ کسی زبان کے زوال کا باعث ہوتی ہیں پُرزور اور زندگی سے بھرپور الفاظ کے لئے جگہ خالی کر دیں گی۔

ہم ابھی تک اس خیال سے چھٹکارا نہیں پا سکے کہ تہذیب اور ادبی قابلیتیں درباری حلقوں سے وابستہ اور ان ہی کی پیداوار ہوتی ہیں ہمارا یہ طرز تخیل ہمیں محدود دائروں میں قید رکھتا ہے اور ہمیں عوام کے دل و دماغ تک پہونچنے کا کوئی راستہ نہیں دکھاتا موجودہ دَور میں تہذیب و تمدن کی عمارت کو ایک وسیع تر جمہوری بنیاد پر تعمیر کرنا ہوگا۔ اور زبان کو بھی جو کہ تہذیب و تمدن کا ایک پیکر ہے انھیں بنیادوں پر قائم ہونا پڑے گا۔

جمہور تک رسائی حاصل کرنے کا سوال محض سادہ الفاظ اور بندشوں کا مسئلہ نہیں ہے اسے ان الفاظ و فقرات کے اندرونی معانی اور تصورات سے بھی برابر کا تعلق ہے۔

ایک جمہور پسند زبان کے لئے ضروری ہے کہ اسے عوام کے مسائل زندگی سے تعلق ہو اور وہ ان کے رنج و راحت اور امید و بیم کا ذریعہ اظہار ہو۔ اسے بحیثیت مجموعی عوام کی زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ نہ کہ خواص کے خیالات کی

نمائندہ یہی ایک صورت ہے جس میں کوئی زبان ایک مستقل زندگی حاصل کرنے کی امید کر سکتی ہے۔

یہ نظریہ محض اُردو یا ہندی نہیں بلکہ ہماری سب ہندوستانی زبانوں پر عائد ہوتا ہے مجھے علم ہے کہ ان سب میں ایسے خیالات کا اظہار ہو رہا ہے اور وہ روز بروز عوام کی طرف مائل ہو رہی ہیں۔ ہمیں اس عمل کو تیز تر کرنا چاہیئے اور ہمارے مصنفین کو ارادۃً اس کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیئے۔

میری رائے میں ہماری زبانوں کو غیر ملکی زبانوں کے قدیم علوم اور جدید ادب سے تراجم کے ذریعے سے شناسائی پیدا کرنی چاہیئے ایسا کرنے سے ہم دوسرے ممالک کی تمدنی ادبی اور معاشرتی تحریکوں سے قریب تر ہو جائیں گے اور تازہ تصورات کی درآمد سے ہماری زبانوں کو تقویت پہونچے گی۔

میرا خیال ہے کہ سب ہندوستانی زبانوں میں بنگالی عوام سے تعلق پیدا کرنے کے لحاظ سے پیش پیش ہے۔ ادبی بنگالی بنگال کی جمہوری زندگی سے کوئی علیحدہ یا دور افتادہ چیز نہیں ہے ایک فرد واحد رابندرا ناتھ ٹیگور کی وہبی قابلیت نے اس خلیج کو پاٹ دیا ہے جو اِنے گنے متمدن خواص اور عوام کے درمیان حائل تھی اور اس کے پیارے گیت اور دلکش نظمیں بنگال کی چھوٹی سے چھوٹی جھونپڑیوں میں بھی سُنی جاتی ہیں ان سے نہ صرف بنگالی ادب میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے بلکہ خود جمہور بنگال کی زندگیاں شاداب ہو رہی ہیں

اور بنگالی زبان نازک ترین ادبی مطالب کو سادہ ترین الفاظ میں ادا کرنے کے قابل ہوگئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ رابندرناتھ جیسے غیر معمولی دل و دماغ والے روز پیدا نہیں ہوتے لیکن ہمیں ان کی مثال کی پیروی سے اپنے لئے صحیح راہ عمل تجویز کرنی چاہئے۔ اس ضمن میں مجھے گجراتی کا ذکر بھی کرنا ہے مجھے بتایا گیا ہے کہ گاندھی جی کی سادہ اور پُرزور زبان نے گجراتی لٹریچر پر بہت نمایاں اثر کیا ہے۔

(۱۱)

اب ہمیں ہندوستانی پر اس کی دوسری حیثیت یعنی ہندوستان کی مشترکہ زبان کے طور پر غور کرنا چاہئے اور اس امر کو مدنظر رکھنا چاہئے کہ اسے بڑی بڑی صوبجاتی زبانوں سے نہ کوئی رقابت ہے اور نہ ان کے مخصوص علاقوں میں مداخلت کی ضرورت۔ اس وقت ہمیں رسم الخط کا سوال ایک طرف رکھ دینا پڑے گا کیونکہ دونوں رسوم کا پھلنا پھولنا ضروری ہے اس میں شک نہیں کہ ہم دونوں رسوم کی تعلیم لازمی قرار نہیں دے سکتے کیونکہ یہ امر عوام پر ایک ناقابل برداشت بار ثابت ہوگا حکومت کو دونوں رسوم کی سرپرستی کرنی چاہئے اور ان میں سے کسی ایک کا انتخاب طلبا یا ان کے والدین پر چھوڑ دینا چاہئے۔ پس ہمیں اب رسم الخط کو چھوڑ کر زبان کی اصلیت پر غور کرنا ہے۔

ہندوستانی ہندوستان کی ملک گیر زبان ہونے کے علاوہ چند ایسی خصوصیات بھی رکھتی ہے جو اسے ایک مشترکہ زبان ہونے کی اہلیت عطا کرتی ہیں اسے اور زبانوں کی بہ نسبت آسانی سے سیکھا جا سکتا ہے اور اس کے قواعد سہل ہیں تذکیر و تانیث کی کچھ الجھنیں ضرور ہیں لیکن سوال ہے کہ کیا ہم ہندوستانی کو اور بھی سادہ بنا سکتے ہیں۔

ہماری رہنمائی کے لئے ایک بہت کامیاب تجربہ پہلے سے موجود ہے یہ بنیادی انگریزی کی تشکیل ہے بہت سے عالموں نے کئی برس کی محنت سے انگریزی کی ایک سادہ صورت تجویز کی ہے جو اگرچہ خالص انگریزی ہے لیکن سیکھنے میں بالکل سہل ہے۔ چند نہایت سادہ قواعد کے سوا گرامر تقریباً غائب ہے اور علمی اصطلاحی اور تجارتی تراکیب کو چھوڑ کر بنیادی لغات کو صرف نوسو اسی ۹۸۰ الفاظ تک محدود کر دیا گیا ہے یہ تمام لغات اور گرامر اور الفاظ ایک صفحہ کاغذ میں سما سکتے ہیں اور ایک معمولی ذہانت رکھنے والا شخص اسے دو ۲ یا تین ۳ ہفتوں میں از بر کر سکتا ہے ہاں اس نئی زبان کے استعمال میں مشق کی لازماً ضرورت ہوگی۔

اس تجربہ کو ان کوششوں سے خلط ملط نہیں کرنا چاہئے جو قبل ازیں دنیا کے لئے ایک عام زبان مثلاً اسپرانٹو وولاپک وغیرہ تجویز کرنے کے لئے کی گئیں۔ ایسی تمام زبانیں سادہ ہونے کے باوجود بے حد مصنوعی تھیں

اس لئے ان کا سیکھنا ایک زائد بار سے کم نہ تھا ان کے جسم میں زندگی کی روح پرور سانس نہیں تھی۔ اور وہ کبھی انسانوں کی ایک بڑی تعداد کی زبان نہیں بن سکتی تھیں۔ اس کے خلاف بنیادی انگریزی ان کی تمام خوبیاں رکھنے کے باوجود مذکورہ بالا نقص سے بری ہے کیونکہ یہ ایک زندہ زبان ہے۔ بنیادی انگریزی سیکھنے سے دوسروں سے گفت وشنید کا نہ صرف ایک سادہ اور نہایت عمدہ ذریعہ حاصل ہو جاتا ہے بلکہ سیکھنے والا معیاری انگریزی کی دہلیز پر پہونچ جاتا ہے اور اگر چاہے تو آسانی سے آگے بڑھ سکتا ہے۔

بنیادی انگریزی کی نسبت میری پرجوش دلچسپی سے غالباً یہ سوال اُٹھایا جائے گا کہ پھر بنیادی انگریزی ہی کو ہندوستان کی مشترکہ زبان کیوں نہ قرار دیا جائے؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس زبان کی طبیعت قطعی طور پر ہمارے اہل ملک کے لئے بالکل اجنبی ہے اور اسے ان پر عائد کرنے کے لئے ہمیں انھیں ان کے موجودہ ماحول سے جُدا کر کے انگریزی فضا میں لانا پڑے گا۔ اس زبان کو رائج کرنے میں جو عملی مشکلات درپیش آئیں گی۔ وہ ہندوستانی کی ترویج کے مقابلے میں جو پہلے سے ملک پر چھا رہی ہے بے حد زیادہ ہوں گی۔

لیکن میرا خیال ہے کہ جہاں ہم انگریزی کو ایک غیر ملکی زبان کے طور پر سکھاتے ہیں (اور ظاہر ہے کہ انگریزی کی تعلیم ایک وسیع پیمانے پر

جاری رکھنی پڑے گی) وہاں بنیادی انگریزی سکھائی جائے اور صرف وہ لوگ معیاری انگریزی سیکھیں جو اس زبان کا بطور خاص مطالعہ کرنا چاہتے ہوں۔

(۱۲)

کیا بنیادی انگریزی کی طرح ہم ایک بنیادی ہندوستانی تیار کر سکتے ہیں؟ میرے خیال میں اگر ہمارے عالم اس طرف توجہ دیں تو یہ بات آسانی سے ہو سکتی ہے۔ گرامر جس قدر سادہ ہو سکے کر دی جائے لیکن اسے موجودہ قواعد کی خلاف ورزی کی اجازت نہ دی جائے۔

اس ضمن میں سب سے ضروری بات یہ مدنظر رکھنی چاہیے کہ یہ بنیادی زبان اگرچہ تمام غیر اصطلاحی خیالات و تصورات کے اظہار کے لئے بجائے خود ایک مکمل چیز ہو لیکن زبان کے وسیع تر مطالعہ کے لئے صرف ایک شمع ہدایت کا کام دے۔ لغات کم و بیش ایک ہزار ایسے الفاظ پر مشتمل ہو سکتی ہے جو بے ترتیبی سے نہ چنے جائیں اور ان کے انتخاب میں یہ امر ملحوظ نہ رکھا جائے کہ وہ ہندوستانی زبانوں کے مشترک الفاظ ہیں۔ بلکہ یہ دیکھا جائے کہ ایسا ہر لفظ مکمل ہو اور کسی خارجی مدد کے بغیر عام بول چال میں اپنا مطلب بخوبی واضح کر سکے۔

ایسی بنیادی ہندوستانی ملک کی مشترکہ زبان قرار دی جائے حکومت کی تھوڑی سی امداد سے یہ نہایت سرعت سے تمام ملک میں پھیل جائے گی۔

اور اس قومی اتحاد کے قیام میں مدد دے گی جو ہم سب کو اس قدر عزیز ہے۔ یہ نہ صرف اُردو اور ہندی کو ایک دوسرے کے قریب تر لے آئے گی۔ بلکہ زبانوں کا ایک آل انڈیا اتحاد قائم کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ ایسی مضبوط اور مشترکہ بنیاد پر اگر زبان کی مختلف صورتیں بھی قائم ہوئیں تو وہ جُدائی کی طرف نہیں لے جائیں گی۔ وہ لوگ جو ہندوستانی کا وسیع تر مطالعہ کرنا چاہیں گے آسانی سے اپنا مقصد حاصل کر سکیں گے اور جو لوگ بنیادی ہندوستان پر قائم رہنا چاہیں گے وہ بھی قوم کی وسیع تر زندگی میں حصّہ لے سکیں گے۔

میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہمیں اردو اور ہندی کے جُداگانہ فروغ پر اعتراض نہیں کرنا چاہیئے۔ دونوں اطراف سے جو نئے الفاظ آئیں گے وہ اگر زندہ الفاظ ہوں گے اور حالات کے اثر یا عوام میں مقبولیت کے باعث ہم تک پہونچیں گے تو وہ یقیناً ہمارے ترکے میں بیش بہا اضافہ کریں گے۔ لیکن ایسے مصنوعی الفاظ زیادہ تر اپنی روز افزوں سیاسی، معاشرتی، علمی اور تجارتی ضرورت کی تکمیل کے لئے بنانے پڑے ہیں۔ ان الفاظ کی صنعت میں ہمیں تواتر اور جداگانہ ذہنیت اختیار کرنے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ ہمیں جرأت سے کام لے کر ایسے غیر ملکی اصطلاحی الفاظ جو دنیا کی زبانوں میں مشترک ہو چکے ہیں۔ بلا تکلف ہندوستانی میں داخل کر لینے چاہئیں نہ صرف

ہندوستانی میں بلکہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی۔ اس طرح ہمارے اہل وطن کو ہندوستانی اور غیر ہندوستانی زبانوں میں ایک ہی قسم کے اصطلاحی الفاظ سے دوچار ہونا پڑے گا اور اس کا فائدہ ظاہر ہے۔ اس کے خلاف کرنے سے ان طالب علموں کے لیے جنھیں مختلف زبانوں میں مختلف اصطلاحات سے سابقہ پڑتا ہے۔ بہت سی الجھنیں پڑجائیں گی۔ ایک علٰحدہ سائنٹیفک اور علمی مجموعۂ الفاظ مرتب کرنے سے ہماری علمی نشو و نما دوسرے علمی حلقوں سے علٰحدہ ہوکر کمزور ہوجائے گی اور اساتذہ اور طلبا پر بے حد بار پڑجائے گا۔ دنیا کی جمہوری زندگی اور پبلک معاملات آپس میں بے حد مربوط ہیں اور مل کر ایک واحد سلسلہ بناتے ہیں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے اہل وطن انھیں سمجھ سکیں اور ان میں حصہ لے سکیں اور غیر ملکی لوگ بھی ہمارے پبلک معاملات میں ایسی ہی دلچسپی لے سکیں۔

اس طرح بہت سے غیر ملکی الفاظ ہندوستانی زبان میں لئے جاسکتے اور لئے جانے چاہئیں۔ مگر ہمیں اپنی زبان میں بھی ایسے اصطلاحی الفاظ کی کافی تعداد دستیاب ہوجائے گی۔ مناسب ہوگا اگر ماہرین زبان عام استعمال کے لئے ایسے الفاظ کی ایک جامع فہرست مرتب کردیں۔ ایسا کرنے سے نہ صرف ان معاملات میں جہاں اختلاف اور ابہام نہایت مذموم ہوتا ہے۔ یکسانیت اور صحت پیدا ہوجائے گی بلکہ بے معنی الفاظ اور بندشوں کا

استعمال بند ہو جائے گا۔ ہمارے اخبار نویس دوستوں کی یہ عادت ہے کہ وہ غیر ملکی الفاظ اور تراکیب کا نہایت بے تکلفانہ ترجمہ کر ڈالتے ہیں جو ان کے اصل مطلب سے چنداں تعلق نہیں رکھتا اور پھر یہ ڈھیلے ڈھالے الفاظ نشر و اشاعت کی کرامات سے رائج الوقت سکہ بن کر خیالات کی بے شمار الجھنیں پیدا کر دیتے ہیں مثلاً ٹریڈ یونین (Trade Union) کا ترجمہ بعض دفعہ بیوپار سنگ کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بالکل درست لفظی ترجمہ ہے لیکن اسے ٹریڈ یونین کے معنوں سے دور کی نسبت بھی نہیں اس سے بہت زیادہ دلچسپ ترجمہ امپیریل پریفرنس (Imperial Preference) کا ہے جسے ایک من چلے اخبار نویس نے "شاہی پسند" کے دلکش الفاظ میں پیش کیا ہے۔

(۱۳)

اب یہ دیکھنا ہے کہ زبان کے متعلق حکومت کی پالیسی کیا ہونی چاہیے۔ حکومت کے لئے عدالتوں، دفاتر اور تعلیم کے معاملے میں اس مسئلے کا فیصلہ کرنا لازمی ہے۔

ہر صوبے میں حکومت کے امور وہاں کی مقامی زبان میں سرانجام پانے چاہئیں۔ لیکن ہر صوبوں میں ہندوستانی کی آل انڈیا حیثیت کا سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا ضروری ہے۔ ہندوستانی بولنے والے صوبوں میں

دونوں رسوم کا سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا لازمی ہے اور ہر شخص کو اس امر کا اختیار ہونا چاہیے کہ وہ کسی عدالت یا دفتر سے تخاطب میں ہندی رسم الخط برتے یا اُردو۔ اور ایسی حالت میں اس پر دوسرے رسم الخط میں نقل مہیا کرنے کا بار نہیں ڈالنا چاہیے کسی ایک رقبہ میں جو رسم الخط رائج ہو وہاں کی عدالت یا دفتر کی بیشتر کارروائی اس میں انجام پائے گی اور اس بات پر اصرار بیجا ہوگا کہ ہر عبارت دونوں رسوم میں لکھی جائے۔ مگر سرکاری اعلانات کا دونوں رسوم میں شائع کیا جانا ضروری ہے۔ سرکاری تعلیم کے لئے کُلیۃً قاعدہ یہ ہو کہ یہ طالب علم کی زبان میں دی جائے۔ پس ہر لسانی رقبہ کے لئے وہاں کی مقامی زبان ذریعہ تعلیم قرار پائے۔ لیکن میں ایک قدم آگے بڑھتا ہوں۔ جہاں کہیں ایک خاص لسانی گروہ سے متعلق افراد کی خاصی تعداد موجود ہو اور ان کی زبان اپنے حلقے کی زبان سے مختلف ہو تو انھیں حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا مطالبہ کریں ایک حد تک ایسے مطالبے کی تکمیل کا انحصار اس بات پر بھی ہوگا کہ ایک خاص مرکز میں اردگرد کے طلبہ آسانی سے جمع ہو سکتے ہوں۔ یہ سہولت پرائمری تعلیم کے لئے ضروری ہوگی اور اگر طلبا کی تعداد کافی ہو تو ثانوی تعلیم کے لئے بھی جائز ٹھہرائی جائے۔

مثلاً کلکتہ میں ذریعہ تعلیم بنگالی ہوگا۔ لیکن وہاں ایسے افراد کے

بہت بڑے بڑے گروہ موجود ہیں جن کی مادری زبانیں ہندوستانی، تامل، تلگو اور گجراتی ہیں۔ ان میں سے ہر گروہ حکومت سے مطالبہ کرسکتا ہے کہ ان کے بچوں کی پرائمری تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے۔ یہ عمل ثانوی تعلیم میں کہاں تک جاری رکھا جاسکتا ہے۔ اس کی بابت میں کچھ نہیں جانتا۔ اس کا انحصار طلباء کی تعداد اور دیگر متعلقہ امور پر ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ ثانوی تعلیم کے ابتدائی درجوں میں اور ان کے بعد ان طلباء کو اپنے لسانی حلقے کی زبان ضرور سیکھنی پڑے گی۔

ہندوستانی بولنے والے صوبوں کے مدارس میں اردو اور دیوناگری دونوں رسوم خط سکھائے جائیں گے اور طلبہ یا ان کے والدین کو ان میں سے ایک کے انتخاب کا حق حاصل ہوگا۔ پرائمری کے درجوں میں صرف ایک رسم الخط سکھایا جائے اور ثانوی مدارج میں دوسرا رسم الخط سیکھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ہندوستانی نہ بولنے والے صوبوں کے مدارس میں ثانوی درجوں میں بنیادی ہندوستانی سکھائی جانی چاہیے اور رسم الخط کے انتخاب کا سوال اشخاص متعلقہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔

یونیورسٹی کی تعلیم بھی لسانی حلقوں کی زبان میں دی جائے اور ہندوستانی (کسی ایک رسم الخط کے ساتھ) اور ایک غیر ملکی زبان لازمی قرار دی جانی چاہیے۔

لیکن یہ الزام صنعتی مدارس اور اعلیٰ صنعتی تعلیم پر عائد نہیں ہونا چاہیے۔

ثانوی مدارس میں غیر ملکی اور ہماری قدیم قومی زبانوں کی تعلیم کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔ لیکن سوائے خاص نصابات لینے اور یونیورسٹی میں داخل ہونے کی صورت کے ان کی تعلیم لازمی قرار نہیں دی جانی چاہیے۔

صوبجاتی زبانوں میں میں نے پنجابی اور پشتو کا ذکر کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پرائمری تعلیم انہی زبانوں میں دی جانی چاہیے۔ لیکن چونکہ یہ کافی طور پر ترقی یافتہ نہیں ہیں۔ غالباً اس لئے اعلیٰ تعلیم کے لئے موزوں ثابت نہیں ہوں گی۔ ان علاقوں میں غالباً اعلیٰ تعلیم کے لئے ہندوستانی ہی بہترین زبان ثابت ہوگی۔

(۱۴)

میں نے اپنی بہت سی باتیں صحیح فرض کر کے جو مختلف تجاویز پیش کی ہیں ان کا تعلق پرائمری تعلیم سے لے کر یونیورسٹی کی تعلیم تک سے ہے ان پر نکتہ چینی کرنا اور ان مشکلات کا واضح کرنا جو ان کی تکمیل میں حائل ہوسکتی ہیں۔ شاید چنداں مشکل نہ ہوگا۔ کیونکہ میں نہ ماہر تعلیم ہوں اور نہ ماہر زبان۔ مگر میرا ماہر نہ ہونا ہی شاید میرے لئے مفید ہے کیونکہ میں اس مسئلہ کو ایک عام شخص کے غیر جانبدارانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھ سکتا ہوں۔

میں اس امر کی بھی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اس مضمون میں تعلیم کے اہم اور مشکل مسئلے پر بحث نہیں کر رہا ہوں۔ میں صرف اس کے لسانی پہلو کا جائزہ لے رہا ہوں۔ جب ہم تعلیم کے مکمل موضوع پر غور کریں گے تو ہمیں بہت سی باتیں مدنظر رکھنی پڑیں گی۔ مثلاً ہمیں اس سوسائٹی اور حکومت کی کیفیت کو ملحوظ رکھنا ہوگا جس میں یہ تعلیم جاری ہوگی۔ ہمیں اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہمارے شہری کیسے ہوں اور ان کے مشاغل کس قسم کے ہوں۔ ہمیں ان کی زندگی اور کاروبار کی رعایت سے ان کی تعلیم کا معیار قائم کرنا ہوگا۔ ہمیں ان کی خانگی۔ سماجی اور پبلک زندگیوں میں ایک ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کرنی ہوگی۔ اگر ہمیں دنیا کی دوسری قوموں کے دوش بدوش چلنا ہے تو ہمیں صنعتی اور سائنٹیفک تربیت پر بہت زیادہ زور دینا ہوگا۔ ہمیں یہ سب کچھ اور اس سے بہت کچھ زیادہ کرنا پڑے گا اور ایسا کرنے میں موجودہ بیکار۔ فرسودہ اور سرگراں نظام تعلیم کو مٹا کر اس کی جگہ زیادہ مضبوط بنیادوں پر ایک نیا نظام تعلیم تعمیر کرنا ہوگا۔

لیکن اس وقت ہمیں اپنی توجہ صرف زبان کے سوال تک محدود رکھ کر کسی متفقہ نتیجہ پر پہونچنا چاہئے۔ میں نے یہ مضمون اس غرض سے لکھا ہے کہ اس پر ایک وسیع تر زاویہ خیال سے اہل بصیرت کو دعوت فکر دوں۔ اگر ہم ان عام اصولوں پر متفق ہو جائیں جن پر میں نے بحث

کی ہے تو عملی اعتبار سے ان کا نفاذ چنداں مشکل ثابت نہ ہوگا۔ موجودہ نام نہاد صوبجاتی خود مختاری کے باوجود ہم ان میں سے بہت سے اصولوں کو نافذ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ہمارے مالی ذرائع ناکافی ہیں اور کئی دیگر مشکلات ہمارے راستے میں حائل ہیں لیکن جس حد تک ممکن ہو ہمیں ان پر عمل پیرائی کی کوشش کرنی چاہئے۔

ممکن ہے کہ میری بعض تجاویز پر ایک عام اتفاق کی صورت نکل آئے اور بعض سے اتفاق نہ کیا جا سکے۔ لیکن ہمیں کم از کم یہ جان لینا چاہئے کہ ہم آپس میں کہاں تک متفق ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد زیر بحث مسائل محدود ہو جائیں گے اور ان پر جدا جدا غور کیا جا سکے گا۔

میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میری رائے میں لسانی رقبے اور صوبجات کی حدود آپس میں منطبق ہونی چاہئیں۔

(۱۵)

مذکورہ بالا غور و خوض کو آسان تر بنانے کے لئے میں اپنی بعض موٹی موٹی تجاویز درج ذیل کرتا ہوں:۔

(۱) ہمارے پبلک کام اور سرکاری تعلیم کے لئے ہر لسانی رقبہ کی مخصوص زبان استعمال ہونی چاہئے۔ اس مطلب کے لئے ہندوستان میں مندرجہ ذیل زبانوں کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا چاہئے:۔

ہندوستانی (اُردو اور ہندی دونوں) بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلوگو، کناری، ملیالم، آڑیا، آسامی، سندھی اور کسی حد تک پشتو اور پنجابی۔

(۲) ہندوستانی بولنے والے رقبوں میں اردو اور ہندی دونوں اپنے جُدا جُدا رسم الخط کے ساتھ سرکاری طور پر تسلیم کی جانی چاہئیں۔ پبلک اعلانات دونوں رسوم میں جاری ہونے لازمی ہیں۔ ہر شخص کو اختیار ہو کہ عدالتوں اور دفاتر کے ساتھ معاملات کرنے میں دونوں میں سے ایک رسم الخط چُن لے اور اسے یہ مجبوری نہیں ہونی چاہئے کہ وہ دوسرے رسم الخط میں اپنی تحریر کی نقل داخل کرے۔

(۳) ہندوستانی رقبے میں ہندوستانی ذریعہ تعلیم ہو گی اور تعلیم دونوں رسم الخط میں دی جائے گی اور دونوں کو تسلیم کیا جائے گا۔ طلبا یا ان کے والدین دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا حق رکھیں گے طلبا پر دونوں رسوم الخط سیکھنے لازم نہیں ہوں گے۔ اگرچہ ثانوی مدارس میں دوسرا رسم الخط سیکھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

(۴) ہندوستانی (مع اپنے دونوں رسوم الخط کے) سرکاری طور پر آل انڈیا زبان تسلیم کی جائے گی اور اس لحاظ سے ہر شخص کو

مجاز ہوگا کہ وہ ہندوستان کے کسی دفتر یا عدالت کے ساتھ ہندوستانی میں معاملہ کرے اور تحریریں دونوں سے کوئی ایک رسم الخط اختیار کرے اور اس پر لازم نہیں ہوگا کہ اپنی تحریر کی نقل دوسرے رسم الخط میں مہیا کرے۔

(۵) دیوناگری، بنگالی، گجراتی اور مرہٹی رسوم الخط کو متحد کرنے اور ایک ایسا مخلوط رسم الخط مقرر کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جو چھاپے، ٹائپ رائٹر اور دیگر جدید ایجادوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکے۔

(۶) سندھی رسم الخط کو اردو میں جذب کر دینا چاہئے اور اردو رسم الخط کو امکانی حد تک سہل کرکے چھاپے اور ٹائپ رائٹر کے لئے موزوں بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

(۷) جنوبی رسوم الخط کو دیوناگری کے قریب تر لانے کی ممکنات کا پتہ چلانا چاہئے اور اگر یہ ممکنات بہم نہ پہونچ سکیں تو مختلف جنوبی زبانوں یعنی تامل، تلوگو، کناری اور ملیالم کے لئے ایک مخلوط رسم الخط کی بنیاد ڈالنی چاہئے۔

(۸) لاطینی رسم الخط میں ہمیں خواہ کیسی ہی خوبیاں نظر آئیں کم از کم موجودہ دور میں اسے رائج کرنے کے امکانات پر غور نہیں کیا جاسکتا پس

ہمارے لئے صرف دو رسوم الخط رہ جائیں گے ہندی، بنگالی، مرہٹی، گجراتی کا مخلوط رسم الخط اور اردو سندھی کا رسم الخط اور اگر ضرورت ہو تو جنوبی زبانوں کا ایک مخلوط رسم الخط اس صورت میں کہ وہ اول الذکر رسم الخط سے مطابقت نہ کر سکیں۔

(۹) ہندوستانی بولنے والے رقبوں میں ہندی اور اُردو کا جداگانہ رجحان اگر ترقی کی طرف مائل ہو تو خطرے کا باعث نہیں اور ان دونوں کے نشو و نما میں رُکاوٹ نہیں ڈالنی چاہیئے۔ یہ جُداگانہ فروغ زیادہ دقیق تصورات کے زبان میں داخل ہونے کا قدرتی نتیجہ ہے۔ ہندی اور اُردو کی علٰحدہ علٰحدہ ترقی بھی ہندوستانی کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ آگے چل کر جب عالمگیر تحریکوں اور قومیت کے جذبہ کا دباؤ اُن پر پڑے گا تو ہر چیز اپنی جگہ پر بیٹھ جائے گی اور پھر جمہور کی عام تعلیم سے ایک معیار اور یکسانیت قائم ہو جائے گی۔

(۱۰) ہمیں زبان کے (اس میں اُردو ہندی کی تخصیص نہیں سب زبانیں مراد ہیں) مقبول عام طرز بیان پر زیادہ توجہ دینی چاہیئے۔ مصنفین کو عوام کی تعلیم کے لئے عوام کی سادہ زبان میں لکھنا چاہیئے اور ان مضامین پر لکھنا چاہیئے جن کی عوام کو ضرورت ہے۔ درباری اور مصنوعی طرز تحریر کی حوصلہ شکنی کرنا اور سادہ اور پُر زور طرز تحریر کو

فروغ دینا چاہئے۔ اس روش سے جہاں اور بہت سے فائدے ہوں گے وہاں اُردو اور ہندی میں یکسانیت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔

(۱۱) بنیادی انگریزی طرز پر ہندوستانی زبان میں سے ایک بنیادی ہندوستانی پیدا کرنی چاہئے۔ یہ ایک سادہ زبان ہوگی جس کی گرامر نہ ہونے سے برابر اور لغات ایک ہزار الفاظ سے زائد نہیں ہوگی۔ اسے معمولی بول چال اور لکھنے پڑھنے کے لئے ایک مکمل زبان بنانا ہوگا۔ اس کا گوشت پوست خالص ہندوستانی ہوگا اور یہ زبان وسیع تر مطالعہ کے لئے پہلے زینے کا کام دے گی۔

(۱۲) بنیادی ہندوستانی کے علاوہ ہمیں متعدد اصطلاحی، علمی، سائنٹیفک سیاسی اور تجارتی الفاظ مقرر کرنے ہوں گے جو اُردو ہندی اور اگر ممکن ہو تو ہندوستانی کی دیگر زبانوں میں بھی یکساں استعمال ہو سکیں گے۔ جہاں کہیں ممکن ہو ایسے الفاظ غیر ملکی زبانوں سے مستعار لے کر اپنی زبان میں جذب کر لئے جائیں اور دیگر مناسب اور موزوں الفاظ اپنی زبان سے چُن کر فہرستیں بنائی جائیں تاکہ تمام اصطلاحی اور سائنٹیفک معمولات میں ہم ایک نہایت صحیح اور یکساں ذخیرۂ الفاظ استعمال کر سکیں۔

(۱۳) حکومت کی تعلیمی پالیسی یہ ہونی چاہئے کہ تعلیم طالب علم کی زبان میں

دی جائے، ہر لسانی رقبہ میں پرائمری سے لے کر یونیورسٹی تک تعلیم کے لئے اس رقبے کی زبان مستعمل ہو۔ اگر کسی زبان کے رقبے میں ایسے طلبا کی ایک کافی تعداد موجود ہو جن کی مادری زبان حلقے کی زبان سے مختلف ہو۔ تو ان کا حق ہو گا کہ پرائمری تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کریں بشرطیکہ وہ ایک مرکزی مقام پر جمع ہو سکیں۔ اگر ان کی تعداد کافی ہو تو یہ بھی ہو سکے کہ انھیں ثانوی تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے۔ مگر ایسے تمام طلبا کے لئے اپنے حلقے کی قدرتی زبان بطور ایک لازمی نصاب کے لینی پڑے گی۔

(۱۴) ہندوستانی نہ بولنے والے صوبوں میں بنیادی ہندوستانی ثانوی مدارس میں سکھائی جائے اور رسم الخط کا سوال طلبا پر چھوڑ دیا جائے۔

(۱۵) یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے ذریعہ تعلیم رقبے کی زبان ہو گی اور ہندوستانی اپنے کسی رسم الخط کے ساتھ اور ایک غیر ملکی زبان لازمی موضوع درس ہوں گے۔ یہ لازمی شرط اعلیٰ صنعتی نصابات کی صورت میں نافذ نہیں کی جائے گی۔ اگرچہ اس حلقے کے طالب علموں کے لئے بھی زبانوں کا سیکھنا مناسب ہو گا۔

(۱۶) ثانوی مدارس میں ہماری قدیم قومی زبانیں اور غیر ملکی زبانیں سکھانے کا انتظام کیا جائے گا لیکن خاص نصابات یا یونیورسٹی میں داخل

ہونے کے لئے تیاری کی صورت کے علاوہ ان کی تعلیم لازمی نہیں ہوگی۔

(۱۷) ہندوستانی زبانوں میں غیر ملکی زبانوں کی قدیم کتابوں کے تراجم بڑے پیمانے پر کئے جانے چاہئیں تاکہ ہماری زبانیں ان ممالک کی تمدنی، ادبی اور سوشل تحریکوں سے لگاؤ پیدا کریں اور اس اتصال سے اپنے لئے طاقت و قوت حاصل کریں۔

ٹرین میں

میرے دوست اکثر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں کس وقت پڑھتا ہوں۔ میری زندگی مختلف قسم کے کاموں سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے جس میں سے شاید کچھ مفید اور کار آمد ہیں اور کچھ کی افادیت مشکوک ہے۔ ایسی حالت میں جبکہ سیاسیات کا خوفناک کاروبار ہماری جوانی کو گھن کی طرح کھا رہا ہے اور وہ دن اور رات اُس کی نذر ہوتے جا رہے ہوں جنھیں ہم اور زیادہ مسرت خیز مشغلوں میں صرف کر سکتے ہیں، کتابوں سے دل لگانا اور اُن کی مسحور کر لینے والی دنیا میں پھرنا آسان کام نہیں ہے۔ تاہم اِن خشک مشاغل میں بھی میں رات کو کچھ وقت ایک ایسی کتاب پڑھنے کے لئے نکالنے کی کوشش کرتا ہوں جو سیاست سے بہت دُور ہے۔ میں ہمیشہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوتا لیکن میرا مطالعہ زیادہ تر گاڑیوں کے اندر ہو جاتا ہے جب میں اس وسیع ملک میں اِدھر سے اُدھر سفر کرتا ہوں۔

اِنٹر یا تیسرا درجہ پڑھنے یا کوئی اور کام کرنے کے لئے ایسی جگہ نہیں ہے

جیسی ہونی چاہئے لیکن بالعموم میرے ساتھی مسافروں کی دوستانہ روش اور ریلوے کے حکام کی مہربانی سے بڑا فرق پیدا ہوجاتا ہے اور میرا خیال ہے کہ میں ایسے سفر میں جو تکلیفیں کہ مسافروں کو پیش آتی رہتی ہیں اُن کے تجربے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ بعض حضرات اپنے حصہ سے زیادہ جگہ لینے کے لئے مجھ سے اصرار کرتے ہیں اور ایسی عنایتوں کے بہت سے واقعات سفر میں ایک خوشگوار انسانی ہمدردی کا عنصر پیدا کردیتے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں تکلیفوں کا شائق ہوں یا اُن کی تلاش کرتا ہوں۔ نہ یہی صحیح ہے کہ میں تیسرے درجے میں اس لئے سفر کرتا ہوں کہ اس میں کوئی خوبی ہے یا ایسا نہ کرنے میں کسی اصول کی شکست کا خوف ہے۔ اصل سوال روپیہ کا ہے۔ تیسرے اور دوسرے درجے کے کرایوں میں اس قدر فرق ہے کہ صرف بہت ہی شدید ضرورت مجھے دوسرے درجے کے پُرعیش سفر پر مائل کرتی ہے۔

ایک زمانے میں، جسے اب بارہ برس ہوتے ہیں، میں حالتِ سفر میں خاص طور پر کانگریس کے متعلق خطوط لکھنے کا کام بہت زیادہ کیا کرتا تھا مختلف ریلوے لائنوں پر بار بار کے تجربے نے مجھ میں یہ اندازہ لگانے کی اہلیت پیدا کردی تھی کہ تحریر کی آسانی کے لحاظ سے کون لائن بہتر ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اس سلسلے میں پہلی جگہ ایسٹ انڈین ریلوے کو دی۔ نارتھ ویسٹرن بھی بُری نہیں لیکن جی، آئی، پی یقیناً بُری ہے وہ انسان کے سارے جسم کو ہلا دیتی ہے

ایسا کیوں ہے میں ٹھیک طور سے نہیں بتا سکتا نہ مجھے یہی معلوم ہے کہ حکومت کے قبضہ کی مختلف گاڑیوں کے کرایوں میں ایک دوسرے سے اتنا زیادہ فرق کیوں ہے۔ اس طرح بھی جی، آئی، پی ریلوے سب سے زیادہ گراں پڑتی ہے یہاں تک کہ اُس کے یہاں معمولی واپسی کے ٹکٹ بھی نہیں ملتے۔

اب میں نے ٹرین میں زیادہ لکھنے کی عادت ترک کردی ہے۔ شاید اب میرے جسم میں اتنا لوچ نہیں رہا کہ وہ چلتی ہوئی ٹرین کے جھٹکوں میں لکھنے کے لئے توازن قائم رکھ سکے۔ لیکن میں سفر میں ایک بکس بھر کر کتابیں ساتھ لے جاتا ہوں یہ کتابیں اُس سے بہت زیادہ ہوتی ہیں جتنی میں پڑھ سکتا ہوں۔ چاہے ایک شخص پڑھنے کا موقعہ نہ پا سکے لیکن اپنے گردو پیش کتابوں کی موجودگی ہی سے ایک طرح کا اطمینان بخش احساس اپنے دل میں پیدا کر سکتا ہے۔

میرا یہ سفر طولانی تھا۔ ہوائی جہاز کے متعدد سفر کے بعد مجھے کراچی کی لمبی مسافت جیسے یورپ کا آدھا راستہ معلوم ہوتی تھی۔ اس لئے میرا بکس مختلف طرح کی کتابوں سے اچھی طرح بھرا ہوا تھا۔ جیسا کہ میرا طریقہ تھا میں انٹر میں سوار ہوا۔ لیکن دوسرے دن لاہور پہونچ کر جب مجھے راستہ میں پڑنے والی گرمی اور گرد وغبار کی خوفناک اور پُر خطر خبریں ملیں تو میرا ارادہ کمزور ہو گیا اور میں نے ٹکٹ دوسرے درجے کا بنوا لیا۔ اس طرح باقاعدہ اور یک گونہ آرام دہ سفر میں مَیں نے سندھ کا ریگستان عبور کیا۔ یہ ایک لحاظ سے بہت اچھا ہوا کیونکہ

یہاں بند ڈبّوں میں بھی گرد و غبار کے باریک ذرّے سوراخوں اور درازوں سے چلے آتے تھے، ہم پر گرد کی تہہ پر تہہ جمتی چلی جا رہی تھی۔ اور سانس لینے میں ہوا بھاری معلوم ہوتی تھی۔ میں نے تیسرے درجے کا خیال کیا اور کانپ گیا۔ میں گرمی اور اس سے زیادہ تکلیف دہ چیزیں سہہ سکتا ہوں لیکن گرد کا برداشت کرنا مجھے بہت زیادہ مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اس لمبے سفر میں مَیں نے ایک کتاب ایک عجیب اور غیر معمولی شخص، ایڈورڈ وِلسن کے متعلق پڑھی جو چڑیوں اور جانوروں سے عشق رکھتا تھا اور جو انٹارکٹک (بحر قطب جنوبی) کے منجمد علاقوں میں آخر وقت تک اسکاٹ کے ساتھ ساتھ رہا۔ اِس کتاب میں میرے لئے دُہری کشش تھی کیونکہ یہ مجھے ایک دوسرے عجیب و غریب انسان سے ملی تھی۔ یہ اے، جی، فریزر کا تحفہ تھا، وہ اے، جی فریزر جو عرصہ تک مغربی افریقہ کے اچی موتا کالج کے پرنسپل رہے۔ یہ جگہ افریقی تعلیم و تربیت کی وہ اعلیٰ اور انوکھی یادگار ہے جسے انھوں نے محنت، محبت اور ہمدردی سے تیار کیا تھا۔

سندھ کا غیر متواضع ریگستان ختم ہوا۔ گاڑی اپنی دُھن میں چلی جا رہی تھی اور میں انٹارکٹک میں دشمنِ عناصر کے خلاف انسانی دلیری، فطرت پر فتح پانے والی ہمت اور ناقابل یقین قوتِ برداشت کے واقعات پڑھنے میں

لگا ہُوا تھا۔ دوستوں کے ساتھ بے پناہ وفاداری اور محنت و مشقت، خود فراموشی اور ہر ممکن مصیبت کے ہوتے ہوئے زندہ دلی کا اظہار قدم قدم پر ہو رہا تھا۔ اور یہ سب اپنے ذاتی نفع کے لئے نہیں اور نہ بہ ظاہر عام لوگوں یا سائنس کے فوری فائدے کے لئے۔ سوال ہوگا تو پھر کیوں؟ صرف اِس لئے کہ انسان میں ایک طرح کی دلیری اور جراُت ہے، ایک روح ہے جو شکست نہیں کھاتی بلکہ لمحہ بہ لمحہ بلند سے بلند تر جانے کی راہیں تلاش کرتی رہتی ہے، ستاروں سے کوئی آواز اُس کے لئے آتی ہے۔ ہم میں سے زیادہ تر اس آواز کو نہیں سنتے لیکن یہی بہت خوب ہے کہ کچھ لوگ سُن لیتے ہیں اور ہماری موجودہ نسل کا معیار اونچا کر دیتے ہیں۔ اُن کے لئے زندگی ایک مسلسل دعوتِ مقابلہ ہے، ایک نامعلوم پُر خطر مہم ہے، اُن کی قوت آزمانے کی ایک کسوٹی ہے۔

"میں زندگی کو روح کی قوت آزمانے کے لئے ایک چیز سمجھتا ہوں"

ایڈورڈ وِلسن ایسا ہی تھا اور یہ بھی کتنا اچھا ہوا کہ قطب جنوبی تک پہونچنے کے بعد وہ اور اُس کے رفقائے کار ابدی آرام کے لئے انٹارکٹک کے وسیع ملک میں لیٹ رہے جہاں طویل دِن کے بعد طویل رات آتی ہے اور ہر وقت سکون چھایا رہتا ہے۔ وہ اُس وسیع البسط میدان میں برف اور اُولے سے گھرے، ہوئے سو رہے ہیں اور انسانی دستکاری نے اُن کے اُوپر یہ موزوں کتبہ کھڑا کر دیا ہے۔

"کوشش کرنا، جستجو کرنا اور پا جانا مگر شکست نہ کھانا"۔

قطبین فتح ہو چکے، ریگستان چھانے جا چکے، اونچے پہاڑ انسانوں کے قابو میں آ گئے اگرچہ ایورسٹ کی بلند چوٹی آج بھی غیر مفتوح اور مغرور کھڑی ہے۔ لیکن انسان ضدی اور جفاکش ہے اور ایورسٹ کو اُس کے سامنے سر جھکانا پڑے گا کیونکہ اُس کے مختصر سے جسم میں ایک دماغ ہے جو مشکلوں کو دھیان میں نہیں لاتا اور ایک روح ہے جو ہارنا نہیں جانتی۔ پھر باقی کیا رہ جاتا ہے؟ زمین چھوٹی ہوتی چلی جاتی ہے اور انسانوں کی روحانی بلند پروازی اور ذوق تجسس اس سے باہر جاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ قطبین تک اڑنا تھوڑے ہی دنوں میں ایک معمولی بات ہو جائے گا۔ بجلی کے تاروں پر چلنے والی معلق گاڑیاں پہاڑوں کے دامن سے گزرتی ہیں، بلندیوں پر آرام دہ ہوٹل میں جہاں بینڈ رات کے سناٹے کو توڑ دیتے ہیں اور برفیلی فضا کے دائمی سکون کا مذاق اُڑاتے ہیں، ادھیڑ عمر کے بیکار لوگ برج کھیلتے اور بد مذاقی کی باتوں میں وقت گنواتے ہیں اور عیش و آرام کے لطف سے تھکے ہوئے نوجوان اور بوڑھے مسرت کی تلاش میں بیکار لگے رہتے ہیں۔

لیکن باہمت اور متجسس مسافر کے لئے اب بھی کافی سامان دلکش باقی ہے۔ جن میں ہمت اور جوش ہے انھیں دنیا کی وسعتیں اپنی طرف اشارے سے بلاتی ہیں اور ستارے آسمانوں پر اپنی دعوتِ مقابلہ شہاب کی شکل میں

بھیجتے ہیں کیا نا معلوم دلکش سفر کے لئے قطبین، ریگستانوں اور پہاڑوں ہی پر جانا ضروری ہے جب کہ اُن لوگوں کے لئے جو اس کے آرزومند ہیں یہ سب کچھ خود زندگی میں موجود ہے؟ ہم نے اپنی زندگی اور سماج کی کیسی بُری حالت بنا رکھی ہے۔ دولت، خوشی اور انسانی زندگی کی آزاد ترقی کی راہوں پر قابو رکھتے ہوئے ابھی ہم بھوک کی مصیبت اور غلامی کی اُس ہمت کُش فضا میں سانس لے رہے ہیں جو اگلے وقتوں سے بھی زیادہ بُری ہے۔ ہمیں اس کے تبدیل کرنے میں اپنے حصہ کے مطابق لگ جانا چاہیے تاکہ انسان اپنی بلند مرتبہ وراثت کے اہل بن جائیں اور اپنی زندگی کو حسن، مسرت اور دلکشی سے معمور کرلیں۔ زندگی کا سفر اشارہ کر رہا ہے اور یہی سب سے بڑا نا معلوم سفر ہے۔

ریگستان پر اندھیرا چھایا ہوا ہے لیکن ٹرین اپنی مقررہ منزل کی طرف بڑھتی چلی جارہی ہے۔ شاید اسی طرح انسانیت بھی لڑکھڑاتی ہوئی بڑھ رہی ہے۔ اگرچہ رات اندھیری ہے اور منزل ہماری نگاہوں سے اوجھل۔ جلد ہی صبح آئے گی اور اس ریگزار کے بدلے نیلا سمندر ہمارے استقبال کو سامنے آئے گا۔

۱۷ر جولائی ۱۹۳۶ء

اپنے دوستوں اور نکتہ چینوں سے

اخباروں اور اخبار نویسوں کا بے حد شکر گذار ہوں کہ وہ ازراہِ عنایت میری تحریر و تقریر کی نشر و اشاعت کرتے ہیں۔ میں خاص طور پر اپنے معترضوں اور نکتہ چینوں کا ممنون ہوں جو میرے لاتعداد نقائص اور بھول چوک کی طرف اشارہ کر کے مجھے صحیح راستہ دکھانے کی اتنی کوشش کرتے ہیں۔ میں ایسی تنقیدوں کو دوسروں کی تعریفوں سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میرے کثیر مشاغل، ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑتے رہنا، بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کرنا، دوستانہ اور پُرجوش مجمعوں میں ہاتھوں ہاتھ پہونچنا، بحث مباحثے، دفتر کے کام کا بوجھ اور پھر خطوں کے انبار کا مقابلہ کرنا، اِس پُرشور دنیا کے ہنگاموں اور جھگڑوں سے پناہ لینے کے لئے کچھ وقت اِدھر اُدھر سے کاٹ کر بچا لینا اور اپنے کو کسی دلکش کتاب میں کھو دینا۔ یہ باتیں میرے لئے بہت کم وقت چھوڑتی ہیں کہ میں دوستوں اور اعتراض کرنے والوں کی فیاضانہ

نصیحتوں پر پوری طرح غور کر سکوں لیکن کبھی کبھی میں ان مشوروں اور تنقیدوں کے سمندر میں غوطہ لگاتا ہوں اور اپنے فطری حلم کے باوجود ایک اُبھار کا جذبہ مجھ پر اس خیال سے طاری ہو جاتا ہے کہ میرے مُنہ سے اتفاقیہ طور پر نکلے ہوئے الفاظ بھی لوگوں کے دلوں میں حرکت پیدا کرتے ہیں اگرچہ کبھی کبھی یہ حرکت غصہ کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے۔

مجھے شکایت نہ کرنی چاہئے اگر بولنے اور لکھنے کی اس کثرت میں کبھی کبھی غلطیاں ہو جاتی ہیں، الفاظ اپنا ربط کھو دیتے ہیں یا فرضی باتیں میرے سر منڈھی جاتی ہیں اور میری مزاح پیدا کرنے کی کوشش سمجھی نہیں جاتی یا سنجیدگی سے اس کا اثر لیا جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ زندگی کی راہ کافی سخت ہے اور اگر اِس میں خوش طبعی کا پہلو نہ پیدا کیا جائے تو اس بوجھ کا اُٹھنا مشکل ہو جائے یہ بات کافی بُری ہے کہ میں اتنی تقریریں کرتا ہوں اور پھر اگر اُن تقریروں کے متعلق ہر غلط رپورٹ کی تصحیح اور ہر غلط ترجمانی کی درستگی بھی کرتا رہوں تو زندگی تلخ ہو جائے۔ جو سوالات مجھ سے پوچھے جاتے ہیں وہ مستزاد ہیں۔ اُن کی تعداد کی انتہا نہیں اور نہ اُن کی قسموں کی حد وہ خدا اور مذہب سے لے کر شادی، اخلاقیات، جنسیات، زمین پر خدا کے سایہ (بادشاہ) سرمایہ داری اور ملکیت تک کے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ سوالات شاذ و نادر ہی میرے بیانات سے یا ملکی مسائل سے کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ درحقیقت یہ چیز نہایت عجیب معلوم ہوتی ہے

کہ کس طرح میرے معترضین میری کہی ہوئی باتوں سے آنکھ بچا کر گذر جاتے ہیں اور دوسری باتوں پر وقت اور زور صرف کرتے ہیں۔

پھر بھی مجھے ان سوالات میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور میں بہ خوشی انھیں حل کرنے میں لگ جاتا اگر عمر اتنی مختصر نہ ہوتی اور زندگی کے دن گنے ہوئے نہ ہوتے۔ بدقسمتی سے ہم ان حالات میں گھرے ہوئے ہیں کہ ہم اپنی جوانی اور اُس کے بعد کا حصہ سیاسیات کی خشک فضا میں رہ کر "کمیونل اوارڈ" (فرقہ وارانہ فیصلہ) اور مسجد شہید گنج کے مسئلہ پر جوش کا مظاہرہ کرنے میں ختم کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد زندگی اور زندگی کے حقیقی مسائل پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں رہتا۔ بہرحال زندگی کے اصل مسائل ہیں، انسانوں کے معاشرتی، قلبی اور روحانی تعلقات اور انسان کا سماج سے تعلق۔ ہم اِن کو پوری طرح دیکھ بھی نہیں سکتے ان کا سلجھانا تو بڑی بات ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس سیاسی اور اقتصادی نظام نے جو ہمیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے ہماری نظر دُھندلی کر دی ہے اور ہمارے جسم کو جکڑ دیا ہے۔

اس لئے موجودہ حالات میں مَیں اِن سوالوں کا جواب دینے میں اپنا وقت نہیں لگا سکتا بلکہ سوال کرنے والے سے اپنی خود نوشت سوانح عمری دیکھنے کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کروں گا جہاں انسان اور دوسری چیزوں کے متعلق میرے عام تصورات ملیں گے۔ لیکن پھر بھی میں اُس وقت بالکل

خاموشی اختیار نہیں کر سکتا جب میرے رفقائے کار کے متعلق فضول اور لاطائل باتیں کہی جاتی ہیں اور میرے الفاظ سند کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کی طرف برابر اشارے ملتے ہیں کہ مجھ میں اور میرے ساتھیوں میں مسلسل کشمکش ہے، کانگریس میں بہت جلد پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہے اور بڑے اہم واقعات رونما ہونے والے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ میرے کچھ الفاظ جو میں نے خواتین کے ایک جلسہ میں بمبئی میں کہے تھے بگاڑ دئے گئے ہیں تاکہ اُن سے وہ مطلب حاصل کیا جائے جو کبھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔

مجھے یقین ہے کہ میں نے لکھنؤ میں اور لکھنؤ کے بعد بھی نہایت آزادی سے اپنے اور کانگریس کی مجلس انتظامیہ کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کی غیر متعین پوزیشن کو صاف کر دیا ہے۔ یہ عجیب اور کسی قدر پریشان کن صورت حال میرے اشتراکی عقائد سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ یہ صرف سیاسی اختلاف تھا جو لکھنؤ میں ظاہر ہو کر سب کے سامنے آیا۔ ہم میں سے کسی نے اِسے راز بنا کر نہیں رکھا کیونکہ ہمیں اس کا احساس تھا کہ اُن اہم اور بنیادی مسائل پر جن کا تعلق عوام سے ہے ہمیں صاف گوئی اور ذہنی بے تعلقی سے کام لینا چاہیے کیونکہ یہی ہندوستان کی قسمت کے آخری فیصلہ کرنے والے ہوں گے اس لئے ہم اختلاف ہی پر اور کھلے ہوئے اختلاف پر رضامند ہو گئے لیکن اس کے بعد ہم امداد باہمی اور اتحاد عمل پر بھی رضامند ہوئے۔ یہ صرف اس لئے نہیں

کہ ہمارے سامنے ہندوستان کی آزادی کا بزرگ تر سوال تھا جسے ہم دل سے عزیز رکھتے ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ ہمارے درمیان اتحاد اور اتفاق کے نکات زیادہ تھے اور اختلاف رائے کے بہت کم۔ یقیناً ہمارے زاویہ نگاہ میں اختلاف تھا اور بعض چیزوں پر زور دینے میں بھی فرق تھا۔ یہ سب کچھ سیاسی تھا اشتراکی نہ تھا اور اگر تھا بھی تو صرف اس حد تک کہ نقطۂ نظر کا یہ اختلاف اور بعض چیزوں پر زور دینا اشتراکیت ہی نے پیدا کیا تھا۔ لکھنؤ کی کسی تجویز میں وہ چیز نہیں ظاہر ہوئی جسے اشتراکی کہہ سکیں۔ اشتراکیوں نے بھی اسے محسوس کیا کہ اصل مسئلہ سیاسی یعنی آزادی کا تھا اور اسی پر انھوں نے اپنے خیالات جما دئے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ مل کر کام کرنے پر رضامندی کا اظہار کر کے میرے ساتھ کام کرنے والوں نے میرا اور میرے خیالاتِ پریشان کا جو احترام کیا ہے میں اُس کے لئے دل سے اُن کا شکر گذار ہوں۔ مجھے اس کا احساس ہے اور ایک مرتبہ میں نے اپنے ساتھیوں سے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے کہ میں کسی قدر تکلیف دہ ہوں۔ میں وہاں کود پڑنا اور دَوڑ جانا چاہتا ہوں جہاں عقلمند اور دُور بیں حضرات موقع اور محل کا خیال کریں گے۔ تاہم انھوں نے مجھے اور میرے مخصوص خیالات کو برداشت کیا۔ اختلاف اور اس قسم کی باتوں کا ذکر بیوقوفی ہے۔ ہمارے محاذ میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوسکتا کیونکہ آزادی ہمیں آواز دیتی ہے اور خون ہماری رگوں میں دَوڑنے لگتا ہے۔

ہم متفق ہوں یا اختلاف رکھیں، یہاں تک کہ ہم ایک دوسرے سے جُدا بھی ہو جائیں لیکن ہم پھر بھی اُس آواز پر ساتھ ہی جائیں گے اور اُن تمام لوگوں کو جو اس آواز کو سنتے اور اس پر لبیک کہتے ہیں ہم اپنے درمیان آنے کے لئے خوش آمدید کہتے ہیں چاہے اُن کے خیالات دوسرے مسائل پر جو کچھ ہوں۔

ایک بار پھر میرے متعلق یہ اطلاع دی گئی ہے کہ میں نے کھادی کے بارے میں کچھ اہانت آمیز باتیں کہی ہیں۔ میں نے یہ بارہا کہا ہے کہ میں کھادی کو ملک کی اقتصادی خرابیوں کا آخری علاج نہیں سمجھتا اس لئے میں اس مشکل کا آخری حل کہیں اور تلاش کرتا ہوں لیکن پھر بھی آج ہم جن حالات میں گھرے ہوئے ہیں اُنھیں دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ کھادی کی ایک خاص سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی اہمیت اور قیمت ہے اس لئے اس کی ہمت افزائی ہونی چاہیئے۔

لیکن زیادہ تر سوالات کا تعلق اشتراکیت (سوشلزم) سے ہوتا ہے جن سے نہ صرف لاعلمی کا اظہار ہوتا ہے بلکہ اُس جوش کا بھی جو ذہن کو تاریک بنا دیتا ہے۔ سوشلزم ایک اقتصادی اصول ہے۔ یہ پیداوار، تقسیم اور دوسرے سماجی مسائل کے باقاعدہ ترتیب دینے کا ایک طریقہ ہے۔ اس کے پیرودں کے خیال کے مطابق اشتراکیت موجودہ سماج کی تمام خرابیوں کا حل ہے لیکن اس اقتصادی نظام پر غور کرتے ہوئے ہم برابر مذہب اور خدا کو درمیان میں لایا کرتے ہیں اور بادشاہ چارلس اوّل کے سر کی طرح روس برابر

اُبھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ میں قادرِ مطلق اور مختلف پُراسرار اور عجیب پرستش کے طریقوں پر بحث کرنے کو بالکل تیار ہوں۔ میں روس کے متعلق بھی گفتگو کر سکتا ہوں کیونکہ آج کل روس میں بڑی دلکشی ہے مگر مجھے خاص مسئلہ سے ہٹائے جانے پر اعتراض ہے۔ یہ بات صرف ذہنی انتشار یا اصل سوال سے عمداً بچنے کی وجہ سے پیدا ہو سکتی ہے۔

مذہب کے معاملہ میں مَیں اسے بالکل مانتا ہوں کہ عقائد اور اعمال کی مکمل آزادی ہونی چاہیئے۔ لوگ خدا کی عبادت ہزاروں طریقوں میں سے کسی طریقے سے کر سکتے ہیں لیکن میں اس کے لئے بھی آزادی چاہتا ہوں کہ اگر میرا جی چاہے تو میں کسی شکل میں خدا کی پرستش نہ کروں اور جن باتوں کو میں وہم پرستی اور سماج کی دشمنی تصور کرتا ہوں اُس سے لوگوں کو روکوں لیکن جب مذہب شخصی مفاد اور سرمایہ داری کے بھیس میں آتا ہے اور لوگوں کو لوٹتا ہے تو اسے مذہب نہ سمجھنا چاہیئے اور اُس کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

میں اُس بنیادی اقتصادی نظریہ پر اعتقاد رکھتا ہوں جو روس کے معاشرتی نظام کی تہ میں ہے۔ میرا خیال ہے کہ روس نے تمدن، تعلیم اور اگر میں روحانیت کے لفظ کو اس کے صحیح مفہوم میں استعمال کر سکوں تو روحانیت میں بھی حیرت خیز ترقی کی ہے۔ لیکن پھر بھی میں ہر اُس بات کو جو وہاں جاری ہے پسند نہیں کرتا اور اسی لئے میں روس کی کورانہ تقلید کی رائے بھی نہیں دیتا۔

یہی وجہ ہے کہ میں سوشلزم (اشتراکیت) کے لفظ کو کمیونزم (اجتماعیت) پر ترجیح دیتا ہوں کیونکہ آخرالذکر لفظ سوویٹ روس کا مترادف بن گیا ہے۔ بمبئی کے بعض سربرآوردہ کاروباری میرے کمیونزم کے بدلے سوشلزم کے لفظ کے استعمال پر بہت اعتراض کرتے ہیں بظاہر اُن کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے اہل وطن کو دھوکا دیتا ہوں۔ اس مسئلہ پر انھیں اِس قدر جوش و خروش کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کمیونزم کے لفظ سے ڈرتا نہیں۔ میری سرشت ہی میں یہ ہے کہ میری تمام ہمدردیاں سب سے زیادہ مظلوم اور سب سے زیادہ دبی ہوئی چیزوں کے ساتھ ہوتی ہیں جبکہ حکومت کی ساری قوت اور ذاتی مفاد کمیونزم کے کچلنے میں صرف ہو رہے ہیں۔ یہی چیز کمیونزم کی طرف میری رغبت اور ہمدردی کا کافی بڑا سبب ہو سکتی ہے۔ دوسرے لوگ اور راستہ اختیار کرتے ہیں اور فطری طور پر قوی اور زبردست سے ملنے پر مائل ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں یہ قوت برطانوی سامراج ہے۔

لیکن الفاظ اور نام پراگندگی پیدا کرتے ہیں۔ میں جس چیز کی جستجو میں ہوں وہ یہ ہے کہ سماج سے نفع حاصل کرنے کا جذبہ نکل جائے، مقابلے کی جگہ خدمت اور امداد باہمی لے لے اور پیداوار منافع کے لئے نہیں بلکہ استعمال کے لئے ہو۔ چونکہ میں تشدد سے نفرت کرتا ہوں اور اسے ذلیل چیز سمجھتا ہوں اس لئے میں خوشی سے موجودہ نظام کو پسند نہیں کر سکتا جس کی بنیاد ہی تشدد ہے

اسی سبب سے میں اور زیادہ پُرامن اور پائدار نظام تلاش کرتا ہوں جس سے تشدد کی جڑیں نکال کر پھینکی جا چکی ہوں، جہاں نفرت نے سُکڑ کر شریفانہ جذبات کے لئے جگہ خالی کر دی ہو۔ میں ان چیزوں کا نام سوشلزم رکھتا ہوں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ ہندوستان میں کس طرح آئے گی، کن کن منازل سے ہو کر گذرے گی اور کن دشواریوں پر قابو پائے گی۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ بغیر کسی اس قسم کی کوشش کے ہم افلاس اور بیکاری کے مسائل حل نہ کر سکیں گے۔ اگر دوسرے طریقے بھی ہیں تو میرے معترض کسی ایسی چیز پر خفا ہونے کے بجائے جسے وہ پسند نہیں کرتے یا شاید سمجھتے نہیں انھیں ملک کے سامنے پیش کیوں نہیں کرتے؟

لیکن قبل اس کے کہ یہاں سوشلزم آئے یا اس کی کوشش بھی کی جائے ہمارے ہاتھ میں اپنی قسمت بنانے کے لئے طاقت بھی ہونی چاہیئے، ہمیں سیاسی آزادی ملنی چاہیئے۔ ہمارے سامنے یہی سب سے بڑا اور سب سے زیادہ قابل توجہ مسئلہ ہے اور چاہے ہم سوشلزم کو مانیں یا نہ مانیں اگر ہم حقیقتاً آزادی کے خواہاں ہیں تو ہمیں اپنی قوتوں کو متحد کر کے اسے اُن ہاتھوں سے چھیننا ہے جو اسے چھوڑنے پر رضامند نہیں ہیں۔

میں مکمل جمہوریت کو مانتا ہوں یعنی سیاسی اور اقتصادی دونوں طرح کی آزادی حاصل ہو۔ فی الحال میں سیاسی جمہوریت کے لئے کام کر رہا ہوں

لیکن سمجھتا ہوں کہ یہی چیز بڑھ کر اور پھیل کر معاشی جمہوریت بھی بن جائے گی۔ کانگریس نے ہمارے سامنے ان مسائل کے حل کرنے کا جو ذریعہ ممکن ہے وہی رکھا ہے اور وہ کانسٹوٹنٹ اسمبلی (Constituent Assembly) کا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آسکتا کہ کوئی شخص جو اپنے کو جمہوریت پسند کہتا ہے کس طرح اس سے اختلاف رکھ سکتا ہے اور دوسرا راستہ تلاش کر سکتا ہے لیکن وہ لوگ جو ہندوستان کے لاکھوں بے سمجھ لوگوں کا تذکرہ کرتے ہیں جیسا کہ بمبئی کے اعلان میں اکیس ۲۱ دستخط کرنے والوں نے کیا، اور اُن کے سامنے ملک کے اہم مسائل پیش کرنے پر اعتراض کرتے ہیں غالباً جمہوریت پسند کہلانا پسند نہ کریں گے۔

کیا ہم اپنے مسائل کا کوئی جمہوری حل چاہتے ہیں؟ یہ ایک سوال ہے جو اپنے معترضین سے پوچھنا چاہوں گا۔ اگر ایسا ہے تو پھر جب میں انھیں عوام کے سامنے رکھتا ہوں اور انھیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں تو یہ شور و غوغا، یہ غصہ میں بھرے ہوئے جذبات کیوں بلند کئے جاتے ہیں؟ میں نے اتفاقاً کہنے کے علاوہ شاید ہی کبھی سوشلزم کا ذکر اُن سے کیا ہو۔ ہاں میں نے اپنے مُلک کے حیرت ناک افلاس، اپنے کسانوں، مزدوروں اور متوسط طبقہ کے لوگوں کی بیکاری اور اس کے علاوہ سب سے اونچے درجہ کے تھوڑے سے لوگوں کے دوسرے طبقوں کے تیز زوال پر البتہ زور دیا ہے۔ اُن

تھوڑے سے لوگوں کی نگاہ میں یہی میرا گناہ ہے۔ لیکن جب ہندوستان کے متعلق سوچنے لگتا ہوں تو میرے سامنے یہی ایک تصویر آتی ہے۔ چاہے میں کوشش بھی کروں مگر اس خیال سے چھٹکارا نہیں مِل سکتا۔ یہ کوئی خوشگوار تصویر نہیں ہے۔ میں اسے پسند نہیں کرتا بلکہ جب اسے دیکھتا ہوں تو کبھی میرا خون سرد ہو جاتا ہے اور کبھی نفرت اور غصہ سے کھولنے لگتا ہے کہ کیا ایسا ہی ہونا چاہیے۔

۵ رجون ۱۹۳۶ء

تامل ناد کو خیرباد کہتے وقت

تامل ناد کے مرد اور عورتو!

میں دو ہفتے آپ کے صوبے میں اِدھر اُدھر پھرا ہوں۔ اس سفر میں میں نے آپ کے مشہور شہر اور بہت سے گاؤں دیکھے۔ میں نے سیکڑوں جلسوں میں عورتوں اور مردوں کے عظیم الشان مجمعوں میں تقریریں کیں۔ ان دو ہفتوں میں ہم اکٹھا رہے اور کافی وقت ساتھ ساتھ بسر کیا۔ شاید ہم ایک دوسرے کو پہلے سے کچھ زیادہ سمجھنے بھی لگے ہیں۔

اب میں پھر شمال کو واپس جا رہا ہوں اور جاتے وقت نہ جانے کتنی یادیں میرے ذہن پر چھائی جا رہی ہیں۔ یہ یادیں لہریں لیتے ہوئے مجمعوں، دیوانگی کی حد تک پہونچے ہوئے جوش، چمکتی ہوئی آنکھوں اور اُن کے اندر سے خاموش جھانکتے ہوئے معاہدوں سے متعلق ہیں۔

میں آپ کے پاس کانگریس کا پیام لایا۔ یہ پیام آپ کے لئے نیا نہ تھا تاہم آپ نے کانگریس اور ملکی آزادی کے عہدِ وفاداری کو

گراں قدر پیمانے پر نئے انداز سے ظاہر کیا - افراد آتے اور جاتے رہتے ہیں لیکن نصب العین رہ جاتا ہے اور ہمیں اشتراک اور اتحاد کی زنجیر میں باندھتا ہے - اس سفر میں ایک بہت بڑی مہم پر اتفاق و اتحاد کا تصور برابر میرے ساتھ رہا۔ ہندوستان کا وہ اتحاد جو اُن اختلافات اور پابندیوں کو توڑ دینا چاہتا ہے جو ہمیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں - میں بالکل بھول گیا کہ میں اپنے گھر سے بہت دُور جنوب میں ہوں - صرف ایک خیال تھا، وہ تھا ہندوستان کی آزادی کا خیال - اور یہ کہ ہم سب ایک دوسرے کے دوست اور ساتھی تھے جو شانہ بہ شانہ اپنے دل کی لگن پوری کرنے کے لئے لڑ رہے تھے - ہندوستان کی محبت سے ہمارے دل بھرے ہوئے تھے اور ہم شوق اور سرگرمی سے آنے والی آزادی کا انتظار کر رہے تھے -

اس آزادی کی محبت کے ساتھ ساتھ سماجی آزادی کا جوش بھی دلوں میں موجزن تھا - ایک خواہش تھی کہ ہمارے اہلِ وطن کی تاراجی کا سلسلہ ختم ہو اور ایک زیادہ منصفانہ نظام قائم ہو جو افلاس کے اسباب کا خاتمہ کر دے اور اُس بیکاری سے نجات دلائے جس میں ہمارے گلے پھنسے ہوئے ہیں - بڑے بڑے مجمع جو مجھے سننے کے لئے جمع ہوتے تھے زیادہ تر ننگے بھوکے اور اپنے تباہ کن بوجھ سے چھٹکارا پانے والے لوگوں سے بھرے ہوتے تھے - اُن کے اور ہمارے دماغوں میں سیاسی آزادی اور سماجی آزادی کا تصور

ایک دوسرے سے ملا ہوا تھا اور جس مستقبل کے لئے ہم کوشاں تھے یہی اس کے دو رُخ تھے۔

لیکن اس حیرتناک جوش اور بے پناہ اظہار محبت میں ضبط اور تنظیم پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر یہ ضائع نہ ہو جائیں۔ کانگریس نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس کی کوشش کی ہے لیکن ابھی ہمیں اور آگے جانا چاہیئے اور اس قوت کو ہندوستان کی آزادی اور کانگریس کے کام میں لگا دینا چاہیئے۔ اس کے لئے کانگریس کو اپنی اپیل کی طرح اپنے نظام کو بھی ہر گاؤں میں پھیلانا چاہیئے اور ہر جگہ وسیع جمہوری بنیاد پر کام کرنا چاہیئے۔ رہنمائی ضروری ہے لیکن تحکم پسندی بُری ہے اور برطانوی اقتدار کی وجہ سے ہم یوں ہی اس میں کافی مبتلا ہیں۔

بعض مقامات پر ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کے انتخابات کے سلسلے میں مقامی جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض تو یقیناً کانگریس اُمیدوار کے انتخاب میں کسی کمزوری کی وجہ سے تھے ایسے لوگ چُنے گئے تھے جو کانگریس کی سچی روح اپنے اندر بہت کم رکھتے تھے اس لئے آخر کار وہ یہ بڑا کھیل نہ کھیل سکے اور کبھی کبھی تو انھوں نے اپنے معاہدے بھی توڑ دئے۔ اس راستے میں خطرے ہیں۔ ہماری قوت گھٹ جائے گی اور ہمارا نصب العین دُھندلا ہوتا چلا جائے گا اگر ہم نے تعداد کی فکر میں پڑ کر

اپنی خصوصیتوں کا معیار گھٹا دیا۔ اس لئے کچھ بھی ہو جائے ہمیں ہمارے اپنے مقاصد کی بلندی سے نیچے نہیں آنا چاہیئے۔

ہمارے جلسوں میں عورتیں حیرت خیز تعداد میں شریک ہوتی رہیں اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کسی حد تک اُن میں بھی سیاسی بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ اُن میں یہ بیداری دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ اس قومی اور سماجی جد وجہد میں اُن کا بھی پوری طرح حصہ لینا لازمی ہے۔

ہمارے سامنے بڑے بڑے مسائل ہیں۔ انھیں حل کرنے کے لئے ہمیں بھی بڑا بن جانا چاہیئے معمولی اور دوسرے درجے کے مسئلوں کو کبھی اس کا موقع نہ دینا چاہیئے کہ وہ ہمارے دماغوں میں پہلی جگہ لے لیں۔

مجھے اس محبت کے لئے جو آپ نے دکھائی آپ کا تہِ دل سے شکر گذار ہونا چاہیئے لیکن یہ سب کچھ کانگریس کے لئے تھا کیونکہ میں کانگریس کا پیامبر بن کر کانگریس کے صدر کی حیثیت سے آپ کے پاس آیا تھا۔ اس پیام کو نہ بھولئے اور یہ بھی نہ بھولئے کہ سچا جوش عمل کی طرف ہدایت کرتا ہے، ہمارا متحدہ عمل کانگریس کے جھنڈے کے نیچے منظم ہونا چاہیئے جو کانگریس کے مقاصد کو آگے بڑھا سکے۔

اب میں واپس جا رہا ہوں لیکن میں اس سفر کو بہت دنوں تک یاد رکھوں گا۔ میں تامل ناد کے رفقائے کار کا پیام دوسری جگہ کے لوگوں تک پہونچاؤں گا۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء

کانگریس اور اشتراکیت

اشتراکیت اچھی چیز ہو یا بُری، مستقبل بعید کا ایک خواب ہو یا حال کا مسئلہ، یہ جو کچھ بھی ہو یا جو کچھ ہو سکتی ہو، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کے دماغ میں اس نے بڑی جگہ اپنے لئے پیدا کرلی ہے۔ یہ لفظ ادھر سے اُدھر ہوتا رہتا ہے اور ہم سے بڑی سنجیدگی سے بتایا جاتا ہے کہ اس کی آڑ میں کمیونزم کی خوفناک پرچھائیں گھات لگائے ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ اس کے بہت سے نقادوں کی معلومات کہ سوشلزم کیا ہے۔ بہت ہی دھندھلی اور ناکافی ہے اور پیشہ ور ماہر اقتصادیات بھی حکومت کا پروپگنڈا کرنے والوں کی طرح مسئلہ کو الجھانے کے لئے خدا، مذہب، شادی اور عورتوں کی تذلیل کا ذکر درمیان میں لاتے ہیں۔ ہمیں شکایت نہ کرنا چاہئے اگرچہ اُن لوگوں کو الف بے کی تعلیم دینا جو کہتے ہیں کہ وہ پڑھ لکھ سکتے ہیں بہت ہی تھکا دینے والا عمل ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے خلاف سب سے زیادہ شور وشغب انھیں لوگوں

کی طرف سے اٹھتا ہے جو اس سے نفرت کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور جو یہ چاہتے ہیں کہ اس خیال اور اس لفظ کا ذکر ہی نہ کیا جائے'۔

سوشلزم (اشتراکیت) جیسا ہر اسکول کے طالب علم کو بھی جاننا چاہیے' ایک معاشی نظریہ ہے جو اُن مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو موجودہ دنیا کو پریشان کر رہے ہیں - یہ تاریخ پر نظر ڈالنے اور اُس کی پیچیدہ رفتار سے اُن اصولوں کے اخذ کرنے کا بھی ایک طریقہ ہے جو انسانی سماج پر حاوی ہیں - انسانوں کی بہت بڑی تعداد اس پر اعتقاد رکھتی ہے اور اسے حاصل کرنا چاہتی ہے - بحرالکاہل سے لے کر بحر بالٹک تک ایک بہت بڑا قطعۂ زمین اسی نظام کے ماتحت ہے۔ دوسرے بڑے بڑے مُلک جیسے فرانس اور اسپین اس کے گرد منڈلا رہے ہیں اور دنیا میں مشکل ہی سے کوئی ایسا ملک ملے گا جہاں اس کے بہت سے ماننے والے موجود نہ ہوں۔ اس کی حقانیت نہ تو اُن دماغوں سے اور نہ اُس تعداد سے قائم ہو سکتی ہے جو اس کی پشت پر ہیں لیکن اس کے اصول ہم ہندوستان کے رہنے والوں سے سنجیدہ اور باعزت غور و فکر کا مطالبہ کرتے ہیں - یہ ہمیں اپنے اقتصادی اور سیاسی مسائل کی جانب متوجہ کر دیتے ہیں اور پُر زور طریقے پر اُن کا حل چاہتے ہیں - غور و خوض کرنے کے بعد ہم اسے بالکل ناپسند کر سکتے ہیں یا تھوڑا بہت اس سے فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں اگرچہ ہم

اس کو پوری طرح قبول کرنے پر تیار نہ ہوں۔ اس اہم امنگ کو جولاکھوں آدمیوں کو حرکت میں لاتی ہے اور بہت سے لوگوں کے دل و دماغ دونوں پر چھا جاتی ہے ایک دم سے نظرانداز کر دینا کسی طرح عقلمندی کا کام نہیں ہوسکتا۔

لیکن یہ بات ٹھیک کہی جاتی ہے کہ ہمارے یہاں سیاسی سوال منظر پر قبضہ کئے ہوے ہے اور آزادی کے بغیر اشتراکیت یا معاشی نظام میں کسی اور انتہا پسند تبدیلی کی تمام گفتگو حماقت ہے۔ سوشلزم کے متعلق بات چیت بھی پیچیدگی پیدا کرتی ہے اور ہماری جماعت میں انتشار کا سبب ہوتی ہے۔ ہمیں سیاسی آزادی اور صرف سیاسی آزادی کے خیال کو مرکز بنا لینا چاہیے۔ یہ دلیل غور و فکر چاہتی ہے کیونکہ ہمیں کوئی ایسی بات نہ کرنی چاہیے جو سامراج کے خلاف ہمارے متحدہ محاذ کو توڑ کر ہمیں کمزور بنا دے۔ سخت سے سخت اشتراکی بھی اِن دلیلوں کو کسی حد تک مان لیتا ہے کیونکہ وہ یہ مانتا ہے کہ فی الحال ہمارا سب سے اہم مقصد سیاسی آزادی ہے۔ ہر چیز خود ہی اس کے بعد آئے گی اور بغیر اس کے ہم کوئی انقلاب انگیز تبدیلی بھی پیدا نہیں کر سکتے۔

یہاں تک تو باتیں مشترک ہیں۔ قومیت ہمارا پہلا جذبہ اور پہلی لگن معلوم ہوتی ہے لیکن پھر بھی اس مشترک نصب العین کو سب ایک ہی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔

ہم میں سے کوئی اپنی جماعت میں افتراق پیدا کرنا نہیں چاہتا اور اپنے طاقتور مخالف کے مقابلے میں ہم برابر ایک متحدہ محاذ کی بات چیت کرتے رہتے ہیں۔ پھر بھی ہم مفاد کے اختلاف کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور جوں جوں ہم سیاسی حیثیت سے آگے بڑھتے ہیں (سوشلزم یا اقتصادی مسئلہ کا کوئی ذکر نہیں) یہ اختلافات اور واضح ہو جاتے ہیں۔ جب کانگریس انتہا پسندوں کے ہاتھ میں پہونچ گئی تو اعتدال پسند کنارہ کش ہو گئے۔ ایسا کسی اقتصادی بنا پر نہیں ہوا بلکہ صرف اس وجہ سے کہ ہم سیاسی حیثیت سے ترقی پسند ہوتے جاتے تھے اور اعتدال پسند عنصر شعوری یا نیم شعوری طور پر یہ محسوس کرنے لگا کہ اتنی ترقی پسندی اُن کے مفاد کو خطرے میں ڈال دے گی۔ وہ الگ ہو گئے لیکن حیرت تو یہ ہے کہ اس افتراق نے کانگریس کو کمزور نہیں کیا اگرچہ پرانے ساتھیوں کے چھوٹنے کا غم کچھ کم نہیں ہوا۔ کانگریس کے حلقہ میں دوسرے لوگ بڑی تعداد میں آگئے اور کانگریس اور زیادہ مضبوط اور نمائندہ ادارہ بن گئی۔ بعد میں ترک موالات کا زمانہ آیا اور اس دفعہ بھی کچھ کانگریسی اکثریت کے ساتھ قدم نہ بڑھا سکے۔ انھوں نے کنارہ کشی اختیار کی لیکن کانگریس میں کمزوری نہیں آئی (اس دفعہ بھی مسئلہ سیاسی تھا اگرچہ اُس کے پیچھے دوسرے مسائل بھی تھے)۔ نئے لوگوں نے بڑی تعداد میں اس میں شرکت کی اور اپنی طولانی تاریخ میں بالکل پہلی دفعہ کانگریس

غیر شہری حلقوں میں بھی ایک قوت سمجھی جانے لگی ۔ اب تک تو نہیں مگر اب یہ ہندوستان کی نمائندگی کرنے لگی اور لاکھوں پر اس کے احکام اور مشوروں کا اثر پڑنے لگا ۔ اسی طرح ہم جتنا ہی سیاسی طور پر آگے بڑھتے چلے گئے اُتنا ہی اوپر کے مختصر گروہ اور نیچے کی بڑی اکثریت کا اندرونی اختلاف نمایاں ہونے لگا ۔ انھیں ہم نے نہیں پیدا کیا ۔ ہم نے یہ کیا کہ اُن کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے اور اس طرح ہماری طاقت اور اثر میں اضافہ ہوتا رہا ۔

آہستہ آہستہ دوسرے مسائل ہمارے سیاسی افق پر رنگ آمیزی کرنے لگے ۔ گاندھی جی نے دیہات میں بسنے والوں کا ذکر کیا ۔ انھوں نے چمپارن اور کیرا میں زور دار تحریکیں چلائیں ۔ یہ کوئی سیاسی مسئلہ نہ تھا اگرچہ نتیجتاً اس کا سیاسی ردِ عمل بھی ہوا ۔ اُنھوں نے ہماری سیاسی تحریک میں خالص قومیت کے ساتھ اِسے بھی کیوں ملا دیا ؟ وہ کیوں اِدھر سے اُدھر ہمارے لوگوں کے افلاس کا ذکر کرتے ہوئے پھرنے لگے ؟ یہ باتیں نئی تھیں ، انھیں نیا رنگ دیا گیا تھا اور ہماری تحریک کے مرکزِ ثقل کو شاید تبدیل کرنا تھا وہ اسے اچھی طرح سمجھتے تھے اور انھوں نے عمداً ہماری سیاسی تحریک کو اقتصادی رنگ دیا ۔ کیا لاکھوں کا کانگریس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جانا خاصکر اس تبدیلی اور گاندھی جی کی شخصیت کی وجہ سے نہیں تھا ؟ ہم سب کمزوروں اور مظلوموں کی گفتگو کرنے لگے اور

وہ بُری طرح تھکے اور کچلے ہوئے کمزور لوگ اطمینان اور اُمید سے ہماری طرف پلٹ پڑے۔

گاندھی جی ہندوستان کے لاکھوں، کروروں آدمیوں کی غریبی پر برابر زور دینے لگے۔ ہم اصولی طور پر اس سے واقف تھے (اور کون ہندوستانی اسے بھلا سکتا تھا؟) کیونکہ ہم نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا، ہمارے سامنے دادا بھائی نوروجی، ڈگبی، رانا ڈے اور رومیش دت جیسے قدیم رہنماؤں کی تعلیمات تھیں۔ لیکن متوسط طبقے کے لوگوں کے لئے یہ معاملہ بس کتابوں اور اعداد و شمار تک تھا۔ گاندھی جی نے اسے ایک زندہ سوال بنا دیا اور ہم نے پہلی مرتبہ خوف زدہ آنکھوں سے دیکھا کہ ہندوستان بھوکے اور مصیبت زدہ لوگوں کے گروہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس بھوک اور بیکاری کو کم کرنے کے لئے وہ سوت کاتنے اور کپڑا بننے کی صنعت کو دوبارہ زندہ کرنے پر زور دیتے تھے۔ بہت سے لوگ جو اپنے کو بہت عقلمند سمجھتے تھے اِس پر ہنستے تھے لیکن چرخہ، چاہے غریبی کے مسئلے کو حل نہ کر سکا ہو پھر بھی بہت سی جانوں کے لئے سکون بخش ثابت ہوا۔ اِس سے بھی زیادہ یہ کہ اُس نے ان لوگوں میں جن میں اس کی بڑی کمی تھی خود اعتمادی اور امدادِ باہمی کی روح پیدا کر دی۔ اس نے ہماری سیاسی لڑائی میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ یہاں بھی ہم یہی دیکھتے ہیں کہ ایک خارجی غیر سیاسی بات نے ہماری قومی تحریک پر اچھا اثر ڈالا۔

زمانہ مابعد میں گاندھی جی نے اچھوتوں کے مسئلے پر بھی زور دیا - ایسا کرنے میں جیسا کہ ضروری تھا انھوں نے بہت سے سناتن دھرمیوں کو ناراض کر دیا - ان پرانی رسموں کے نمائندوں اور ثروت وجاہ کے محافظوں اور ترقی پسند فرقوں میں تصادم ہوا - اس ڈر سے گاندھی جی نے اچھوت کے خلاف صف آرائی کرنے میں تامل نہیں کیا - یہ براہ راست سیاسی مسئلہ نہ تھا پھر بھی اسے اٹھایا گیا اور ٹھیک اٹھایا گیا -

کانگریس میں اور کانگریس کے باہر مفاد کا یہ تصادم ہر وقت ہمارے سامنے آتا رہتا ہے - چاہے وہ ساردا ایکٹ ہو یا ڈاکٹر بھگوانداس کا نیا بل، چاہے کوئی سیاسی اقدام ہو جو مختلف باتوں پر اثر انداز ہوتا ہو یا مزدور اور کسان کے متعلق کوئی بات ہو، مفاد کا یہ تصادم ضرور پیدا ہوتا ہے - ہمیں ان ٹکروں سے ضرور بچنا چاہیے لیکن جب یہ موجود ہی ہیں تو ہم انھیں نظرانداز کس طرح کر سکتے ہیں ؟ پھر ہمیں اس کے بارے میں کرنا کیا چاہیے ؟ سولہ سال تک اس بات پر زور دینے کے بعد کہ ہم عوام کے لئے کام کر رہے ہیں، جب یہ تصادم اُن کے مفاد سے ہوتا ہے تو ہمارے پاس صرف ایک جواب ہے اور وہ جواب وہ ہے جو گاندھی جی نے ۱۹۳۱ء کی گول میز کانفرنس کی ایک تقریر میں دیا - انھوں نے کہا "کانگریس اصل میں سب سے بڑھ کر اُن خاموش بھوکے انسانوں کی نمائندہ ہے جو کروڑوں کی تعداد میں

اُن سات لاکھ گاؤں میں پھیلے ہوئے ہیں جو برطانوی ہند اور ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں واقع ہیں۔ ہر مفاد کی صورت جو کانگریس کی نگاہ میں تحفظ کے لائق ہے ان کروروں خاموش انسانوں کے مفاد کے ماتحت ہوگی۔ اس لئے آپ لوگوں کو بہ ظاہر اکثر مفاد میں تصادم نظر آتا ہوگا اور مجھے کانگریس کی جانب سے یہ کہنے میں ذرا بھی تامّل نہیں ہے کہ اگر حقیقتاً کوئی اہم تصادم ہوا تو کانگریس ان کروروں انسانوں کے لئے اپنے ہر مفاد کی قربانی کردے گی"۔

کسانوں سے ہمارے روزانہ بڑھتے ہوئے تعلقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم زیادہ سے زیادہ انھیں کی اچھائی اور بُرائی کی روشنی میں سوچنے لگے۔ بردولی صوبۂ متحدہ اور دوسری جگھوں پر کسان تحریکیں اٹھیں اکثر، مقامی کانگریس کمیٹیوں کو اپنی خواہش کے خلاف مفاد کے اس اختلاف کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور اپنے دیہات کے ممبروں کو مشورہ دینا پڑتا تھا کہ انھیں کون سی راہ اختیار کرنی چاہئے۔ بعض صوبوں میں صوبائی کمیٹیوں نے یہی کیا۔

۱۹۲۹ء کی گرمیوں میں خود آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنے بمبئی کے جلسہ میں اس سوال کا کھُل کر مقابلہ کیا اور ملک کو اُصولی راستہ دکھایا۔ اس نے پورا قومی پس منظر سامنے رکھ کر اور سیاسی آزادی پر زور دے کر پوری قوت سے اس کا اعلان کیا کہ ملک کا موجودہ اقتصادی نظام ہمارے افلاس کے

بنیادی اسباب میں سے ایک ہے تجویز کے الفاظ حسب ذیل تھے :۔

"اِس کمیٹی کے خیال میں ہندوستانیوں کے ہولناک افلاس اور مصائب کا سبب صرف یہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں بیرونی لوٹ مچی ہوئی ہے بلکہ سماج کا معاشی نظام بھی ہے جسے غیر ملکی حکومت اس لئے مدد پہونچاتی ہے تاکہ اُس کی لوٹ جاری رہ سکے۔ اِس لئے اس افلاس اور تکلیف کو دور کرنے اور ہندوستانی عوام کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے موجودہ اقتصادی اور معاشرتی نظام میں انقلاب انگیز تبدیلی کرنا اور حیرت خیز عدم مساوات کو دُور کرنا بیحد ضروری ہے"!

"انقلاب انگیز تبدیلیاں"! ابھی زیادہ دن نہیں ہوے جب میں نے یہی الفاظ لکھنؤ میں استعمال کئے تو بہت سے لوگوں نے سوچا کہ وہ کانگریس کے پلیٹ فارم کے لئے نئے ہیں۔ بہت تھوڑے سے سوشلسٹ بھی اس عام پالیسی اور نقطۂ نظر میں کوئی اضافہ کرسکے۔ پھر یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ کانگریس سوشلسٹ ہوگئی۔ یہ روز بہ روز ہندوستانیوں کی غربت اور تکلیف کا احساس کرتی جاتی تھی اور یہ خیال بڑھتا جاتا تھا کہ صرف سیاسی تغیرات کافی نہیں بلکہ کچھ اور ہونا چاہیے۔ یہ "کچھ اور" وہی "انقلاب انگیز تبدیلی" اور موجودہ اقتصادی اور معاشی نظام میں تغیر تھا۔ یہ تبدیلی کیا ہوگی کانگریس نے بیان نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں اسے ناصاف اور مشکوک رہنا بھی چاہیے تھا۔

سِول نافرمانی شروع ہوئی یہ ایک سیاسی مقصد کے لئے سیاسی تحریک تھی۔

ہم نے پھر مفاد کے تصادم کو سامنے آتے دیکھا اور بڑے بڑے سرمایہ دار اور دوسرے مفاد رکھنے والے کسی دُور رُس سیاسی تغیرات کے خوف سے اس تحریک کی مخالفت کرتے رہے اور برطانوی حکومت کی حمایت۔ صوبۂ متحدہ کی طرح کے بعض حصوں میں کسانوں کی تحریک کی وجہ سے یہ تصادم اور نمایاں تھا۔

کراچی میں اس اقتصادی تبدیلی کی جانب قدم اور تیز اُٹھے۔ کانگریس بہت زیادہ آگے جانے سے ہچکچاتی تھی لیکن رُک بھی نہ سکتی تھی اس نے پھر اعلان کیا کہ ”عوام کی تاراجی کا خاتمہ کرنے کے لئے سیاسی آزادی میں کروڑوں بھوکے انسانوں کی معاشی آزادی بھی شامل ہونا چاہیے“ کانگریس نے مزدوری وغیرہ کے بارے میں بھی بات کرنا شروع کیا اور یہ ظاہر کر دیا کہ ”جمہوریت تمام بنیادی اور ضروری صنعتوں اور ملازمتوں، معدنیات، نہر اور دریا، جہازرانی اور دوسرے ذرائع آمدورفت پر اپنا قبضہ رکھے گی“۔ یہ ایک اشتراکی تجویز تھی لیکن پھر بھی سوشلزم سے بہت دُور۔

اسی طرح کانگریس واقعات کی قوت اور حقیقت کے اثر سے اقتصادی مسئلہ پر غور کرنے کے لئے بھی مجبور ہوئی۔ سیاسی آزادی کے لئے انتہائی جوش و خروش کے باوجود یہ اسے اقتصادی آزادی سے الگ نہ کر سکی۔ دونوں ایک دوسرے سے نہ جدا ہونے والے انداز میں وابستہ ہیں۔ ہم نے انھیں علٰحدہ رکھنے کی کوشش کی اور صرف سیاسی آزادی پر ساری توجہ رکھنی چاہی

لیکن اقتصادی مسئلہ بھی اندر آنے پر ضد کرتا رہا۔ ہم نے ان تصادمات سے آنکھ بند کر لینا چاہا لیکن سیاسی افق پر بھی برابر یہ نمایاں ہوتے رہے۔ گول میز کانفرنس نے خود غرضی کے مفاد رکھنے والوں کو برطانیہ کے پیچھے پناہ لیکر ہندوستان کی آزادی چاہنے والوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اس طرح دکھا کہ ایک الہامی منظر کی طرح سب کچھ روشن ہو گیا۔

حافظہ بہت ناپائدار ہوتا ہے اور بہت سے لوگ کانگریس اور ہندوستان کی اس ماضی قریب کی تاریخ کو بھول گئے۔ اشتراکیت اور سماج کے اقتصادی نظام میں تبدیلی یہ ایسے نئے خیالات نہیں ہیں کہ جنھیں کانگریس نے کبھی سنا ہی نہ ہو اور نہ مفاد کا تصادم کوئی نیا تصور ہے۔ پھر بھی یہ بالکل صحیح ہے کہ موجودہ کانگریس اشتراکی نہیں ہے۔ لیکن چاہے یہ اشتراکی ہو یا نہ ہو، برسوں ہوئے یہ ایک ایسا ادارہ نہیں رہا جو اقتصادی مسئلہ سے قطع نظر کر کے صرف سیاسی حیثیت سے غور کرے۔ اس وقت بھی جب کہ میں یہ لکھ رہا ہوں اِس کے خاص کاموں میں ایک کام یہ بھی ہے کہ کسانوں کی شکایات اور تکالیف کی تحقیقات کر کے اور اُس سلسلہ میں کوئی پروگرام بنائے۔ یہ اور دوسرے معاشی مسائل کا مقابلہ کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔ ایسا کرنے میں جہاں کہیں بھی مفاد کا تصادم ہوگا اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے، ہر اُس مفاد کو جو عوام کے مفاد سے ٹکراتا ہے قربان کرنا پڑے گا۔

یہ بات صاف ہے کہ ہمیں اپنی پوری توجہ سیاسی مسئلہ یعنی ہندوستان کی آزادی پر لگا دینی چاہیئے۔ یہ ہمارے لئے پہلی اساسی اہمیت رکھتا ہے ہر وہ عمل یا تصور جو اس مسئلہ کو دھندلا بناتا ہے ناخوشگوار ہے اور اس کی ہمت افزائی نہ کرنی چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ اس مسئلہ پر کانگریس کے ہر طبقہ میں اتفاق ہے۔ پھر سوشلزم کا تذکرہ ہی کیوں ہے؟

جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ اس لئے نہیں ہے کہ کوئی اشتراکی خیال کرتا ہے کہ ہندوستان کی آزادی قائم ہونے کے پہلے ہی سوشلزم کے لئے کوئی جگہ نکل سکے گی۔ یہ صرف آزادی کے بعد ہی آسکتی ہے اور وہ بھی اُس وقت جب ہندوستان کی حالت اِس کے لئے موزوں ہو اور یہاں کی اکثریت اِس کے لئے تیار ہو۔ لیکن اشتراکی نقطۂ نظر سیاسی جدوجہد میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ سیاسی مسئلہ اس سے واضح ہوجاتا ہے اور ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ آزادی کا صحیح سیاسی مفہوم (معاشرتی مفہوم کے علاوہ) کیا ہونا چاہیئے۔ خود آزادی کی تعبیریں مختلف طرح کی گئی ہیں لیکن ایک اشتراکی کے لئے اس کا صرف ایک مفہوم ہے اور وہ مفہوم سامراج شاہی سے ہر طرح کے تعلق سے اظہار بیزاری کرنا ہے۔ اس لئے ہماری سیاسی قوت کے سامراج دشمن رُخ کو اہمیت دی جاتی ہے اِس طرح ہمیں اپنے دوسرے کاموں کو ناپنے کے لئے ایک پیمانہ ہاتھ آجاتا ہے۔

علاوہ بریں اشتراکی نقطۂ نظر اِس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ ہمیں عوام کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے اور ہماری جد وجہد کو عوام ہی کی جد وجہد ہونا چاہیئے۔ (کانگریس نے بھی گذشتہ پندرہ سال میں مختلف صورتوں سے اسی پر زور دیا ہے)۔ آزادی کا مقصد عوام کی تباہی و بربادی کا خاتمہ ہونا چاہیئے۔

یہ بحث ہمیں اس بات پر بھی غور کرنے پر متوجہ کرتی ہے کہ کس قسم کا "سوراج"، ہمارا نصب العین ہے۔ قابل قدر اصرار کے ساتھ ڈاکٹر بھگوانداس کا کئی برس سے یہ مطالبہ رہا ہے کہ سوراج کی تعریف ہو جانی چاہیئے میں اُن کے بعض خیالات میں اُن سے متفق نہیں لیکن اس میں متفق ہوں کہ ہم چاہے کتنا ہی غیر معین طریقہ پر سہی مگر بغیر یہ ظاہر کئے ہوئے کہ ہم کس قسم کا سوراج چاہتے ہیں۔ سوراج کے بارے میں برابر گفتگو نہیں کر سکتے۔ کیا ملک کی حکومت میں موجودہ دَور کے سرمایہ دار اور دوسرے مفاد رکھنے والے برطانویوں کے جانشین بن جائیں گے؟ ظاہر ہے کہ کانگریس کی یہ پالیسی نہیں ہو سکتی کیونکہ ہم بارہا اس بات کا اعلان کر چکے ہیں کہ ہم انسانوں کی لوٹ اور تباہی کے خلاف ہیں۔ اس لئے یہ لازم آتا ہے کہ ہم عوام کی تقویت کو اپنا مقصد بنالیں تاکہ ہندوستان سے شہنشاہیت کے رخصت ہونے پر حقیقتاً کچھ قوت ان کے ہاتھ میں ہو۔

عوام کی یہ تقویت اور اس کے ذریعے سے کانگریس کی مضبوطی صرف

اسی لئے ضروری نہیں ہے کہ یہ ہمارا عین مقصد ہے بلکہ خود قوت کے لحاظ سے بھی ضروری ہے۔ صرف عوام اس جد وجہد کو یہ بھی قوت پہونچا سکتے ہیں، صرف وہ اس سیاسی لڑائی کو ختم تک لڑ سکتے ہیں۔

اس طرح اشتراکی نقطۂ نظر ہماری موجودہ جنگ میں ہماری مدد کرتا ہے۔ یہ اِس وقت صرف ایک بیکار، دُور دراز اور مشتبہ مستقبل کے متعلق علمی مباحثہ کا دروازہ کھولنے کا سوال نہیں ہے بلکہ اپنی سیاسی پالیسی کو اس طرح کے سانچے میں ڈھالنے کا سوال ہے جو اسے اور زیادہ موثر اور طاقتور بنا سکے۔ یہ سوشلزم نہیں بلکہ سامراج دشمنی ہے۔ یہ وہ سیاسی پہلو ہے جو اشتراکی نقطۂ نظر سے دکھائی دیتا ہے۔

بے شک سوشلزم اس سے آگے بھی دیکھتا ہے۔ اس کا مقصد ہوتا ہے نئے سرے سے سماجی نظام کی تشکیل، ایسی تشکیل جس کی بنیاد نفع اٹھانے کے جذبات کی نفی پر ہو۔ فی الحال یہ ممکن نہیں ہے اس لئے ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کو اس پر دھیان دینا ہی محض علمی اور ناوقت بات معلوم ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ خیال تنگ نظری پر مبنی ہوگا۔ کیونکہ اصل مقصد پر غور و خوض اور اُس کی صفائی، چاہے ہم اُسے طے نہ کر سکیں، مقصد کے حاصل کرنے اور سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ جب سیاسی آزادی حاصل ہوگی تو طاقت کس کے ہاتھوں میں جائے گی؟ کیونکہ معاشرتی تبدیلیاں اسی پر

منحصر ہوں گی اور اگر ہم معاشرتی تبدیلی چاہتے ہیں تو ہمیں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ جو لوگ تبدیلیاں چاہتے ہیں اُن کے ہاتھ میں تبدیل کرنے کی قوت بھی ہو۔ اگر یہ ہمارا نصب العین نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری ساری جد و جہد کا مقصد یہ تھا کہ ہم نے ہندوستان کو اُن سرمایہ داروں اور خود غرضی کے مفاد رکھنے والوں کے لئے محفوظ کر دیا ہے جو کوئی تبدیلی نہیں چاہتے۔

اشتراکی ان سوالات کے حل کے لئے مارکسیت (Marxism) کا استعمال کرتا ہے۔ یہ گذشتہ اور موجودہ تاریخ پر نظر ڈالنے کا ایک طریقہ ہے۔ آج کوئی مارکس کی عظمت سے انکار نہیں کر سکتا لیکن اسے بہت کم لوگ محسوس کرتے ہیں کہ اُس کے واقعات کی صحیح ترجمانی، جس نے تاریخ کی طویل اور پیچیدہ راہ روشن کر دی کوئی اتفاقی یا تیز تبدیلی نہیں تھی، اس کی جڑیں ماضی کی گہرائیوں میں تھیں، یونانیوں، رومیوں اور نشاۃ ثانیہ اور مابعد کے یوروپین مفکرین کو بھی اس کا علم تھا۔ وہ تاریخ کو ایک تحریک اور خیالات اور مفاد کے تصادم کی حیثیت سے جانتے تھے۔ مارکس نے اس قدیم فلسفہ کو سائنس کی روشنی میں دیکھا، اسے پھیلایا اور اسے اس حسن سے ظاہر کیا کہ ساری دُنیا متاثر ہو گئی۔ اس اظہار میں کہیں کہیں کوئی بات چھوٹی ہوئی بھی ہو سکتی ہے اور کسی کسی جگہ ضرورت سے زیادہ اہمیت بھی دیا جانا ممکن ہے۔ ہمیں یہ نہیں چاہیے کہ ہم اُسے چند عقائد کی طرح دیکھیں بلکہ اس لحاظ سے

دیکھنا چاہیے کہ تاریخ اور سماجی تغیرات پر نظر ڈالنے کا ایک حکیمانہ طریقہ ہے۔ اِس پر بہت شور کیا جاتا ہے کہ مارکس نے زندگی کے صرف اقتصادی پہلو پر زور دیا۔ اُس نے اس پر اس لئے زور دیا کہ یہ اہم بھی ہے اور اسے نظر انداز کرنے کا ایک عام رجحان پیدا ہو گیا تھا لیکن اُس نے کبھی اُن دوسری طاقتوں کو نظر انداز نہیں کیا جو انسانوں پر اثر ڈالتی ہیں اور واقعات کو ترتیب دیتی ہیں۔

مارکس ایسا نام ہے جو بہت سے ایسے لوگوں کو خوفزدہ کر دیتا ہے جو اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ ایسے لوگوں کو شاید یہ بات سُن کر دلچسپی ہوگی جو ابھی کچھ دن پہلے برطانیہ کے ایک ایسے معزز اور باوقار لبرل نے کہی جسے کسی طرح اس معاملے میں سرگرمی لینے والا نہیں کہہ سکتے۔ جون ۱۹۳۱ء میں لارڈ لوتھین نے لندن اسکول آف اکنامکس کے سالانہ جلسے کے موقع پر کہا:۔

"کیا موجودہ سماج کی خرابیوں کی جو تشخیص مارکس نے کی ہے اُس میں اس سے زیادہ سچائی نہیں ہے جتنی ہم خیال کرتے ہیں؟ میں اعتراف کرتا ہوں کہ مارکس اور لینن کی پیشین گوئیاں نہایت تکلیف دہ صحت کے ساتھ پوری ہوتی جا رہی ہیں۔ جب ہم مغربی دنیا کی موجودہ حالت پر نظر کرتے ہیں اور اس کے مصائب کے سلسلے کا جاری رہنا دیکھتے ہیں تو کیا یہ بات بالکل صاف ظاہر نہیں ہو جاتی کہ ہمیں بنیادی اسباب و علل پر اُس سے بہت زیادہ گہری نظر

ڈالنے کی ضرورت ہے جس سے ہم آج تک دیکھنے کے عادی رہے ہیں؟ اور میرا خیال ہے کہ جب ہم ایسا کریں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مارکس کی تشخیص کا زیادہ حصہ بالکل صحیح ہے۔"

ایک ایسے شخص کا اعتراف جو آسانی سے ہندوستان کا وائسرائے بن سکتا ہے، اہمیت رکھتا ہے۔ اپنے طبقے کے تمام تعصبات اور ماحول کے پرزور دباؤ کے باوجود اُن کی حساس ذہانت مارکس کی تجویز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی ممکن ہے کہ لارڈ لوتھین نے گذشتہ پانچ سال میں اپنی رائے بدل دی ہو میں نہیں کہہ سکتا کہ ۱۹۳۱ء کی کہی ہوئی بات اُن کے موجودہ خیالات کی کتنی ترجمانی کرتی ہے۔

لیکن اس کانگریس کے سامنے مارکس کے نظریہ کا سوال نہیں ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ آیا ہمیں اُن بُرے نتائج سے لڑنا چاہئے جو ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں یا اُن اسباب کی گفتگو کرنا چاہئے جو ان نتائج کی تہ میں ہیں۔ وہ لوگ جو صرف نتائج پر غور کرتے ہیں مشکل ہی سے دُور تک جا سکتے ہیں۔ "انھیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ وہ نتائج سے برسرِ پیکار ہیں اُن نتائج کے اسباب سے نہیں۔ وہ لوگ پستی کی طرف جانے والی تحریک کی چال کو دھیمی کر رہے ہیں لیکن اُس کا راستہ بدل نہیں رہے ہیں۔ وہ مرض کا علاج نہیں کر رہے ہیں بلکہ وقتی طور پر درد کو گھٹانے والی دوائیں استعمال کر رہے ہیں"۔

اسباب ہوں یا اثرات۔ یہی اصل مسئلہ ہے۔ اگر ہم اسباب کی

جستجو کریں، جیسا کہ ہمیں کرنا ہی چاہیے، تو اشتراکی تجزیہ ان پر بڑی روشنی ڈالتا ہے اور اس طرح اگرچہ اشتراکی حکومت مستقبل بعید کا ایک خواب ہی کیوں نہ ہو جیسے ہم میں سے بہت سے لوگ شاید دیکھنے کو زندہ بھی نہ رہیں تاہم سوشلزم موجودہ دور کی راستہ بتانے والی روشنی ہے جو اس راستہ کو روشن کرتی ہے جس پر ہمیں چلنا ہے۔

اشتراکیوں کا یہی خیال ہے۔ لیکن انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ بہت سے دوسرے لوگ جو اس جد و جہد میں اُن کے رفیق کار ہیں اس طرح نہیں سوچتے۔ جیسا کہ کچھ لوگ کر سکتے ہیں وہ یہ نہیں کر سکتے کہ وہ ایک بند عالمانہ حیثیت اختیار کر لیں اور اپنی علحدہ ایک ٹولی بنا لیں۔ انھیں دوسرے طریقوں سے اپنے کو حق بجانب دکھانا پڑتا ہے اور اس طرح انھیں دوسرے ساتھیوں اور سارے ملک کو اپنے نقطۂ خیال تک لانے کی کوشش کرنا پڑتی ہے۔ بات یہ ہے کہ چاہے ہم سوشلزم کے معاملے میں متحد ہوں یا اختلاف رکھتے ہوں ہم آزادی کی منزل کی جانب ایک ساتھ قدم بڑھاتے ہیں۔

۱۰ جولائی ۱۹۳۶ء

پیامات۔ انتخاب کے موقع پر

(بہار)

کمان سے چھوٹے ہوئے تیر کی طرح میں سات دن تک بہار میں پھرتا رہا اور جہاں کہیں بھی گیا کانگریس کا پیام لے گیا۔ اس ایک ہفتہ میں میں نے اس صوبے کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے جاکر نیپال کی سرحد تک سفر کیا۔ گاؤں میں مجھے افلاس کے مارے ہوئے دیہاتیوں کے بڑے بڑے مجمعوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، میں اُن مشہور شہروں سے ہوکر گذرا جو تاریخ اور روایات میں مشہور ہیں اور اُن نئے شہروں سے بھی جہاں صنعتی کارخانے اور تجارت، بے کاری اور ریلوے کی ہرتالیں ہیں۔ میں نے اُس لوہے کے شہر، جمشید پور اور کوئلے کے سیاہ علاقے کو بھی عبور کیا۔ میں بڑی تیزی سے چھوٹا ناگپور سے بھی گذر گیا جو اپنے خوبصورت جنگلوں اور غیر متمدن ابتدائی انسانوں کے لئے مشہور ہے۔ ہر مقام پر

میں نے کانگریس کے پیام کا پُرجوش خیر مقدم کرتے ہوئے لوگوں کو پایا، ہر قدم پر لامحدود خلوص اور محبت کا اظہار دیکھا۔ میں نہایت افسوس کے ساتھ اس صوبے سے رخصت ہو رہا ہوں لیکن میں اپنے ساتھ یہاں کے لوگوں کی فیاضانہ محبت کی فرحت بخش یاد لئے جاتا ہوں۔ آئندہ کی سرگرمیوں اور خطروں میں مجھے اس سے قوت اور تازگی حاصل ہوگی۔ بہار کے مرد اور عورتو! ایک عظیم الشان اور اہم مہم کے عزیز رفیقو! میں تمھارے لئے خوش بختی، ہمت اور استقلال کی دعا کرتا ہوں۔

جنوری ۱۹۳۷ء

(صوبۂ متحدہ)

(۱)

میں نے صوبۂ متحدہ کے اضلاع کا دورہ ختم کر لیا ہے اور اب دکن کی جانب مہاراشٹر اور کرناٹک جا رہا ہوں میں قریب قریب اس صوبے کے کل اڑتالیس اضلاع میں گذشتہ مہینوں اور ہفتوں میں گیا اور اپنے اہلِ وطن کا حیرت خیز جوش دیکھنے کے بعد مسرت اور اعتماد کے ساتھ واپس ہوا ہوں۔ کانگریس کا نام شہر اور دیہات میں یکساں طور پر جادو کا اثر رکھتا ہے۔ یہ ہمارے کروروں انسانوں کے لئے اُمید اور پناہ کا گھر بن گیا ہے اب

ہمارے حاکموں اور فائدہ اٹھانے والوں کی فوجی قوتیں بھی ان کروروں انسانوں کو دبا کر نہیں رکھ سکتیں۔ وہ طویل راتوں سے تھک چکے ہیں، انھیں نسیم سحر کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے اس لئے کانگریس کے ہمت آفریں اور پناہ گزیں جھنڈے کے سایہ میں ہم فتح کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔

اس وقت ہمیں انتخابات کا مقابلہ کرنا ہے۔ کل اور پرسوں ووٹ دینے والے اُن جگہوں پر جائیں گے جہاں ووٹ دئے جاتے ہیں۔ ہر مرد اور عورت رائے دینے والے کے لئے فرض ہے کہ وہ ملک کا حق ادا کرے اور کانگریس کو ووٹ دے اس طرح ہم لاکھوں ہاتھوں سے آزادی کا شعلہ فشاں عہد لکھیں گے۔

۱۶ر فروری ۱۹۳۷ء

(۲)

صوبۂ متحدہ کے رفیقو! میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں اور دُور دراز کرناٹک سے آپ کی فتح میں شریک ہوں۔ جیسا کہ ہمارا خیال تھا ہم نے چُناؤ میں بڑی زبردست فتح حاصل کی لیکن یہ جیت ہے کس کی؟ یقیناً یہ جیت انفرادی اور ذاتی حیثیت میں ہمارے اُمیدواروں کی نہیں ہے اور نہ کانگریس کے اُن سپاہیوں اور کام کرنے والوں کی ہے جنھوں نے اس کامیابی کے لئے محنت و مشقت کی۔ یہ فتح کانگریس کی ہے، وہ کانگریس

جس نے ہمیں پالا ہے اور ہمارے لاکھوں بھائیوں کے دلوں میں امید کی آگ روشن ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ فاتح خود وہ عوام ہیں جنھوں نے ہر طرح کے دباؤ، دھمکی، ظلم اور ترغیب کے باوجود فتح حاصل کی۔ ہمارے دیہاتی رائے دہندوں کا باقاعدہ جلوس کی شکل میں لمبی لمبی مسافتیں طے کرکے، قومی جھنڈا لئے ہوئے پولنگ اسٹیشن تک جانا اور متفقہ طور پر کانگریس کے امیدوار کو ووٹ دینا، ہر حیثیت سے ایک دلکش اور ہمت افزا منظر تھا۔ انھوں نے ہماری آواز پر کان دیا اور کانگریس کے پیام کو سن کر بڑی شان سے لبیک کہا۔ ہندوستان کے دوسرے حصّوں کی طرح صوبۂ متحدہ بھی نئے قانون کو مکمل طور پر رد کرنے، اُس کے خاتمہ کے لئے لڑنے اور کانسٹیٹوئنٹ اسمبلی (سارے ملک کی قانون ساز جماعت جو مُلک کا دستورِ اساسی بنائے گی) کی بنیاد پر نئے سرے سے قانون بنانے کے لئے آمادہ اور مستعد ہے۔ لیکن سب سے زیادہ یہ صحیح ہے کہ عوام نے کانگریس کو ووٹ دیئے کیونکہ انھوں نے یہ بات محسوس کی کہ کانگریس اُن کے مفاد کے لئے ہے، اُن کی خدمت گذار ہے اور اُن کی صحیح نمائندہ ہے۔ ہمیں اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے اور عوام کے لنگر سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ رہنا چاہئے۔ یہی چیز آخر میں ہماری کامیابی کا سبب بنے گی اور ہمارے وہ وعدے جو ہم نے اپنے بھائیوں سے کئے ہیں اس طرح وفا ہوں گے۔ کوئی دوسرا اقدام اپنے مقصد سے

اور عوام کی اُن اُمیدوں سے جو ہم نے لاکھوں دلوں میں پیدا کر دی ہیں غدّاری کے برابر ہوگا۔ یو۔پی۔ بہار اور دوسری جگہوں سے اس انتخاب میں ہمیں یہ سبق ملا ہے کہ ہم جہاں کہیں بھی براہِ راست عوام کے پاس گئے ہیں اور اُس صاف اور سادہ زبان میں بات چیت کی ہے جسے وہ سمجھتے ہیں، انھوں نے خوشی اور دِل سے اپنی تمام قوت ہماری تائید میں صرف کر دی جہاں ہم نے کمزوری دکھائی اور سمجھوتے کی بات چیت کرنے لگے وہاں ہماری فتح مکمل نہیں ہوئی۔ ہمارے بہترین اور سب سے زیادہ مضبوط امیدوار کانگریس کے وہ کام کرنے والے تھے جو ذاتی ذرائع اور اثرات نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے ہمیں اس فتحمندی پر مغرور نہ ہونا چاہئے بلکہ محسوس کرنا چاہئے کہ اس کا سہرا عوام کے سر ہے۔ یو۔پی۔ بہار اور ہندوستان کے دوسرے حصّوں کے بسنے والوں نے ہندوستان کی برطانوی شہنشاہیت کو ملک چھوڑنے کی اطلاع دے دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بمبئی، گجرات، مہاراشٹرا اور کرناٹک بھی اسی پر عمل پیرا ہوں گے اور یہی اطلاع پوری قوت کے ساتھ دیں گے۔ سامراج شاہی کے دن گنے ہوئے ہیں، قوم نے اس کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پر عمل کریں اور عوام سے اپنا رشتہ اور مضبوط کریں۔ انتخاب تو جلد ہی ختم ہو جائے گا لیکن جس کام کا عہد ہم نے کیا ہے وہ باقی رہے گا ہمیں اُس کام کے لئے اپنے تئیں تیار کرنا ہے۔ کامل اعتماد کے ساتھ ہم اس

آخری فتح کی طرف قدم اٹھا رہے ہیں۔

۱۲ فروری ۱۹۳۷ء

(جنوبی اور مغربی ہندوستان کے لوگوں سے)

میں اپنے طولانی سفر کے بعد اب شمال کو واپس جا رہا ہوں۔ میں واپس جا رہا ہوں تاکہ سوراج کی طویل تر جاترا کی تیاری کروں جس کے مقابلے میں یہ سفر ایک قدم کے برابر ہے۔ میں کانگریس کا پیغام جنوب اور مغرب میں لے گیا لیکن اب آپ نے اس پیغام کو صرف میری کمزور آواز میں نہیں بلکہ شمالی ہندوستان کے کروروں انسانوں سے سُنا ہے جو کانگریس کی آواز پر جمع ہو گئے، اور جن کی آزادی کے لئے گرجتی ہوئی صدا ہندوستان کی وادیوں اور چوڑے میدانوں میں گونج رہی ہے۔ آپ کے دِلوں میں اس آواز کی بازگشت کس شکل میں نمایاں ہوتی ہے؟ کیا عوام کی اِس ہمت افزا چیخ پر آپ کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے نہیں لگتا؟ ہندوستان آپ کے دلیر جواب کا منتظر ہے اور جانتا ہے کہ وہ جواب کیا ہوگا۔ رجعت پسندی اور آزادی کے دشمنوں سے بچیے، اور کانگریس کے ساتھ ہو جائیے، ایک ہی قطار میں ہو کر ہمیں ساتھ ساتھ سوراج کی طرف بڑھنا چاہیے۔ اس آواز کو اَن سُنی کرنے کی ہمت کس میں ہے؟

فروری ۱۹۳۷ء

کانگریس اور مسلمان

(۱)

مسٹر جناح نے حال ہی میں تقریر کرتے ہوئے میرے اس خیال پر کہ حقیقتاً ہندوستان میں گورنمنٹ اور کانگریس صرف دو ہی فریق ہیں، اعتراض کیا ہے اور مجھے یاد دلایا ہے کہ ایک تیسری جماعت بھی ہے جو ہندوستانی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اپنی اس تقریر کے دوران میں انھوں نے بعض غور طلب باتیں کہی ہیں۔ میں بہار میں ہوں اور دوڑ دھوپ میں مصروف، اس لئے مجھے وقت نہ مل سکا کہ میں مسٹر جناح کی تقریر پر اتنا غور کرتا جس کی وہ مستحق ہے۔ لیکن جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس کی اہمیت مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں ایک تھکا دینے والے پروگرام اور دن بھر کی بھاری محنت کے بعد بھی کچھ وقت نکالوں اور چند جملے پیش کروں۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسٹر جناح نے ایک ایسی بات کہہ دی ہے جو فرقہ پرستی کو انتہا تک پہونچاتی ہے۔ انھیں بنگالی مسلمانوں کے

مسائل میں کانگریس کی مداخلت پر اعتراض ہے اور وہ کانگریس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دے۔ یہ اعتراض اور یہ مطالبہ بھائی پرمانند کی اُن باتوں سے ایک طرح کی خاندانی مشابہت رکھتا ہے جو انھوں نے ہندو فرقہ پرستوں کی جانب سے وقتاً فوقتاً کہی ہیں۔ اگر منطقی نتیجہ نکالا جائے تو مسٹر جناح کے بیان کا مطلب یہ ہوا کہ جمہور کے معاملات میں غیر مسلموں کو مسلمانوں کے افعال سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے سیاسی معاشرتی اور اقتصادی مسائل میں مسلمانوں کو ایک علٰحدہ طبقہ کی طرح الگ کام کرنا چاہیے اور دوسرے فرقوں سے اس طرح معاملت رکھنا چاہیے جیسے ایک قوم دوسرے سے رکھتی ہے۔ یہی صورت تجارتی انجمنوں، کسانوں کی انجمن، کاروبار، چیمبر آف کامرس اور اس طرح کے دوسرے اداروں میں بھی ہونی چاہیے۔ ہندوستان میں مسلمان ایک علٰحدہ قوم ہیں اور جو اس حقیقت کو بھول جاتا ہے وہ روح القدس کا گنہگار ہوتا ہے اور مسٹر جناح کو ناراض کرتا ہے۔

اچھا سوال یہ ہے کہ مسلمان کون ہیں؟ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہی لوگ مسلمان ہیں جو مسٹر جناح اور مسلم لیگ کی پیروی کرتے ہیں مسٹر جناح ہمیں بتاتے ہیں کہ جب مولانا محمد علی نے کانگریس میں شرکت اختیار کی تو انھوں نے گویا مسلمانوں کے خلاف جنگ کی۔ یہ ایک معمولی بات تھی کہ

اس وقت ہزارہا مسلمان کانگریس کے ممبر تھے اور اس کے ہمدرد و مددگار تھے۔ مسلم لیگ کے باہر ہونے اور مسٹر جناح کی پیروی نہ کرنے کی وجہ سے وہ غیر مسلم سمجھے جا سکتے ہیں۔ غالباً مسٹر جناح کے خیال کے مطابق بنگال اور پنجاب کے کسان اور احرار مسلم لیگ کے حلقہ سے باہر ہونے کی وجہ سے دراصل مسلمان نہیں ہیں۔ اب ہمیں مذہبیت کے جانچنے کی ایک نئی کسوٹی ہاتھ آگئی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسٹر جناح اُن بے شمار مسلمانوں کے بارے میں ہم کانگریسیوں سے کیا چاہیں گے جو کانگریس میں شریک ہیں۔ کیا وہ ہم سے یہ امید کریں گے کہ ہم اُن سے استعفٰی کا مطالبہ کریں اور باادب انداز میں اُن کے پاس بھیج دیں؟ اور میں ان کسانوں اور دیہاتی مسلمانوں کے مجمع سے کیا کہوں جو میری بات سننے کے لئے میرے پاس آتے ہیں؟

مجھے یہ اصول بہت عجیب نقصان دہ اور مسلمانوں کے حق میں ناانصافی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ ان کا ایک "تیسری جماعت" کی طرف اشارہ بھی مسلمانوں کے لئے کچھ زیادہ خوش کن یا قابل تعریف نہیں ہے۔ برطانوی سامراج اور ہندوستانی قومیت کے درمیان میں وہ مسلمانوں کو ایک علیحدہ جماعت کی حیثیت سے رکھنا چاہتے ہیں بظاہر اس کا یہی مقصد معلوم ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے کے خلاف آلۂ کار کے طور پر استعمال کر سکیں اور جمہور کے مفاد کو فرقہ وارانہ مفاد پر بھینٹ چڑھا دیں۔

میں ایسے یا اسی طرح کے کسی اور فرقہ وارانہ طریقے پر بالکل سوچ ہی نہیں سکتا اور مسٹر جناح سے ہر طرح کی معذرت کے بعد کیا اشارتاً یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایسے خیالات ازمنۂ وسطیٰ کے ہیں اور اب ان کا وقت نہیں رہا۔ ان کا کوئی تعلق عصر حاضر کے حالات اور موجودہ دَور کے مسائل سے نہیں کیونکہ یہ خالصتہً سیاسی اور اقتصادی ہیں۔ مذہب ایک ذاتی اور شخصی معاملہ ہونے کے علاوہ اعتقاد کی چیز ہے لیکن سیاسی اور معاشی مسائل میں مذہب پر زور دینا اندھیرے میں جانا ہے جہاں اصل مسائل سے ہٹنے کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ مسلمان کسان کا مفاد کس طرح ہندو کسان کے مفاد سے مختلف ہے؟ یا کس طرح مسلمان مزدور، کاریگر، تاجر، زمیندار یا مل کے مالک کا مفاد ایسے ہی ہندوؤں کے مقابلہ میں الگ ہے؟ جو رشتے لوگوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتے ہیں وہ اُن کے اقتصادی مفاد اور اگر ملک محکوم ہوا تو قومی مفاد ہوتے ہیں۔ مذہبی سوالات اٹھ سکتے ہیں اور مذہبی جھگڑے کھڑے ہو سکتے ہیں لیکن ان کا مقابلہ کر کے تصفیہ کرنا چاہیئے۔ اُن کو سلجھانے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اُن کے عمل اور اثر کو محدود کر دیا جائے اور انھیں سیاست اور معاشیات میں دخل انداز ہونے سے روکا جائے۔ فرقہ وارانہ باتوں سے سیاسی اور اقتصادی مسائل کو ہوا دینا رجعت پسندی کی ہمت افزائی اور دَورِ وسطیٰ میں پلٹ جانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ ایک سعی لاحاصل ہوگی کیونکہ

حقائق کو نظر انداز کرتی ہے۔

آج کی حقیقتیں افلاس اور بھوک، بیکاری اور برطانوی سامراج اور ہندوستانی قومیت کا تصادم ہیں۔ فرقہ وارانہ انداز میں ان پر کس طرح غور کیا جا سکتا ہے؟

اِس میں شک نہیں کہ آج کل ملک میں بہت سی پارٹیاں، جماعتیں اور پرانے خیال کے افراد ہیں۔ لیکن تاریخی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو اصل مقابلہ شہنشاہیت اور قومیت میں ہے۔ کوئی "تیسری جماعت" اور رجحان یا غیر معین گروہ تاریخی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے ان کی کوئی مستقل قوت نہیں ہوتی، ایسی جماعتیں الکشن اور اسی طرح کے دوسرے موقعوں پر سرگرم کار ہوتی ہیں اور دوسرے اوقات میں دب جاتی ہیں۔ کانگریس ہندوستانی قومیت کی نمائندگی کرتی ہے اس لئے وہ ایک تاریخی مستقبل کی ذمہ دار ہے۔ اسی سبب سے یہی تنہا ادارہ ہے جس نے ہندوستان میں بڑا وقار پیدا کر لیا ہے اور وہ قوت اور ارادہ اکٹھا کیا ہے جو برطانوی سامراج سے مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے اس طرح تجزیہ کرنے کے بعد یہی حاصل ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اس وقت صرف دو قوتیں ہیں اور وہ برطانوی سامراج اور ہندوستانی قومیت کی نمائندہ کانگریس کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ ملک میں اور دوسری اہم قوتیں بھی ہیں جو ایک نیا سماجی نقطۂ نظر پیش

کرتی ہیں لیکن وہ کانگریس سے ملی ہوئی ہیں۔ فرقہ وارانہ جتھہ بندیوں میں اس طرح کی کوئی اہمیت نہیں ہے اگرچہ کبھی کبھی اہمیت اُن کے سر تھوپی جاتی ہے۔

مسٹر جناح لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک پارٹی کے لیڈر رہیں اس پارٹی کے ممبروں نے اپنی پارٹی سے اور ایک دوسرے سے حیرت خیز بے تعلقی کا اظہار کیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ بات یہ ہے کہ کوئی مشترک اصول یا پالیسی انہیں آپس میں وابستہ نہیں کئے ہوئے ہے اور جب کسی حقیقی مسئلہ سے سابقہ پڑتا ہے تو وہ الگ ہو جاتے ہیں۔ بالکل یہی نتیجہ مذہبی جماعتوں کا ہونا لازمی ہے۔

یہاں مطلق العنان رہنماؤں (ڈکٹیٹروں) اور ناسمجھ مقلدوں کا سوال نہیں ہے۔ کانگریس ایک جمہوری ادارہ ہے جس کی جڑیں ہندوستانی سرزمین میں گہری جاتی ہیں۔ اس کا دروازہ ہر اُس ہندوستانی کے لئے کھُلا ہوا ہے جو آزادی پر اعتقاد رکھتا ہے۔ اس کے لئے سب سے مقدم مسئلہ ایسی آزادی ہے جو مفلسی اور دوسروں کی لوٹ مار سے نجات دلائے۔ کانگریس سے غلطیاں ہو سکتی ہیں لیکن یہ ہمیشہ قومیت اور قومی آزادی کی اصطلاح میں سوچتی ہے اور محدود یا فرقہ وارانہ انداز خیال سے بچنے کی کوشش کرتی ہے۔

مسلم لیگ کا کیا نصب العین ہے؟ کیا اس کا مقصد ہندوستان کی آزادی اور سامراج دشمنی ہے؟ میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت کی نمائندگی ضرور کرتی ہے

جو قابل عزت ہیں لیکن جن کا دائرۂ عمل متوسط طبقہ کا اوپری حصہ ہے، جو مسلمان عوام سے کوئی رابطہ نہیں رکھتے اور متوسط طبقہ کے نچلے حصہ سے بھی بہت کم سابقہ رکھتے ہیں۔ کیا میں مسٹر جناح سے اشارتاً بتا سکتا ہوں کہ میں مسلم لیگ کے بہت سے ممبروں سے کہیں زیادہ مسلم عوام سے قریب تر ہوں؟ میں اُن کی بھوک اور غریبی کے بارے میں اُن لوگوں سے زیادہ جانتا ہوں جو تناسب فیصدی، کونسل کی نشستوں اور حکومت کی ملازمتوں کی بات کیا کرتے ہیں۔ پنجاب اور دوسرے مقامات پر میرے سامنے مسلمانوں کے بہت بڑے مجمع رہے ہیں انھوں نے مجھ سے کبھی فرقہ وارانہ مسائل، تناسب فی صدی یا جُداگانہ انتخاب کے بارے میں سوال نہیں کیا۔ اُن کی ساری دلچسپی لگان اور مالگذاری، قرض، آبپاشی کے محصول، بیکاری اور اسی طرح کے دوسرے بوجھوں سے متعلق تھی جو وہ اٹھائے ہوئے ہیں۔

کانگریس کے صدر کی حیثیت سے میں اس بات کا اعزاز اور حق رکھتا ہوں کہ میں سارے ملک کے اُن لاتعداد مسلمانوں کی نمائندگی کروں جنھوں نے آزادی کی لڑائی میں پُر جگری سے حصہ لیا، جنھوں نے آزادی کے لئے مصیبتیں اٹھائیں اور کانگریس کے جھنڈے کے نیچے کھڑے ہو کر دوسروں کے دوش بدوش ہماری تاریخی جنگ میں شریک ہوئے میں اُن بہادر مسلمانوں کی نمائندگی کرتا ہوں جو آج بھی ہماری فوجوں کی پہلی صف میں کھڑے ہیں اور جنھوں نے

گذشتہ سالوں کی تکلیف اور مشقت میں بھی کانگریس کے ساتھ ثابت قدمی کھائی ہے، میں عوام کی بھوک اور غریبی کی نمائندگی کرتا ہوں چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ روٹی، زمین، کام اور سیکڑوں پیس ڈالنے والے بوجھوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا مطالبہ، ناقابل برداشت مظالم سے آزادی حاصل کرنے کی تڑپ میں ان سب کا نمائندہ ہوں کیونکہ کانگریس انھیں کے لئے ہے اور کانگریس نے مجھے ان اصولوں کو بلند کرنے اور اُس مشعل کو اونچا کرنے کا ذمہ دار بنایا ہے جسے اُس نے ہمارے ملک کے تاریک گوشوں کو روشن کرنے اور اپنے بھائیوں کے مصیبت زدہ دلوں میں اُمید، قوت اور چمک پیدا کرنے کے لئے جلایا ہے۔

کانگریس ہر طرح کے اتحادِ عمل کا استقبال کرتی ہے۔ اس نے ہمیشہ سامراج شاہی کے مقابلے میں ایک متحدہ محاذ بنانے پر زور دیا ہے۔ وہ نہایت خوشی سے مسلم لیگ اور دوسرے اداروں سے اتحادِ عمل کرے گی لیکن اس اتحاد کی بنیاد سامراج دشمنی اور عوام کی بہبودی پر رکھی جا سکتی ہے۔ کانگریس کے خیال میں اونچے طبقے کے مٹھی بھر لوگوں کے درمیان ایسا سمجھوتہ جو عوام کی ضرورتوں کو نظر انداز کردے کوئی پائدار یا حقیقی قیمت نہیں رکھتا۔ کانگریس عوام سے سودا کرتی ہے کیونکہ در اصل وہ انھیں کے مسائل سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ عوام خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان فرقہ وارانہ مسائل کی بہت کم

پرواہ کرتے ہیں۔ وہ پوری قوت اور استقلال کے ساتھ اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ انھیں معاشی اطمینان حاصل ہو اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب سیاسی آزادی مل جائے۔ اس وسیع بنیاد پر ملک کے اُن تمام عناصر کا پورا پورا اتحادِ عمل ہو سکتا ہے جو عوام کا بھلا چاہتے ہیں اور اپنے لئے سامراج شاہی سے چھٹکارا۔

۱۰ر جنوری ۱۹۳۷ء

(۲)

کانگریس میں مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کے مسئلہ پر حال میں بہت کچھ توجہ دی گئی ہے۔ اُن ہندوؤں اور مسلمانوں نے جو کانگریس میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اس پر غور کیا ہے اور اُن لوگوں نے بھی جو گو کہ کانگریس کے ہمدرد ہیں لیکن اُس میں شریک ہوتے ہوئے ہچکچاتے ہیں اس بات پر توجہ کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ مسلم عوام لازمی طور پر رفتہ رفتہ ان مشترکہ مصیبتوں اور اقتصادی مسئلوں پر جو مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے یکساں ہیں غور کرنے لگے ہیں۔ ان نئی تحریکوں کا ردِ عمل کرنے کے لئے چند برگزیدہ مسلمانوں نے عام مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے سے روکنے کی کوشش کی ہے

یہاں تک کہ ان سے یہ بھی کہا ہے کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو اس کے نتائج سخت خطرناک ہوں گے اور اندیشہ ہے کہ سنگین سانحات رونما ہوں۔ مجھے ان مباحثوں میں حصہ لینے کا کوئی شوق نہیں کیونکہ ان میں فریقین رفتہ رفتہ ذاتیات پر اُتر آتے ہیں اور غیر متعلق باتوں پر اکثر بحث چھڑ جاتی ہے۔ لہٰذا میں جو کچھ لکھ رہا ہوں یہ کسی مباحثہ چھیڑنے کے ارادہ سے نہیں بلکہ اس نیت سے کہ خیالات میں کوئی ابہام باقی نہ رہے اور کانگریس کا نقطۂ نظر لوگ بخوبی اور صاف صاف سمجھ سکیں۔ میں نے ایسا محسوس کیا ہے کہ کبھی کبھی کانگریس والے بھی اس کو صحیح طور پر سمجھنے میں قاصر رہتے ہیں اور مسلمانوں یا دیگر مذہبی جماعتوں سے معاہدہ یا صلح کرنے کی گفتگو کرتے ہیں۔

کانگریس ایک سیاسی جماعت ہے جو لازمی طور پر اقتصادی مسائل بھی طے کرنا چاہتی ہے کیونکہ ان مسائل کا (اور دیگر مسائل کے مقابلے میں) عوام کی زندگی سے کہیں زیادہ گہرا تعلق ہے۔ کانگریس کا مقصد سیاسی خودمختاری ہے یعنی ہندوستانی عوام کا بلا قیدِ مذہب طاقت حاصل کرنا ہے۔ ہندوستان کے کروڑوں بسنے والوں میں سے ہر فرد اس طاقت میں اپنا حصہ پائےگا کیونکہ جس نئے نظام کے لئے ہم جد وجہد کر رہے ہیں اُس میں اُس کا بہرہ مند ہونا لازمی ہے۔ ہماری مصیبت، ناداری اور

بے روزگاری کے دور کرنے کا دارومدار اسی نئے نظام پر ہے - غلامی اور مفلوک الحالی تو ہندوستانیوں کی مشترکہ قسمت ہے چاہے اُن کا مذہب کچھ بھی ہو - لہذا آزادی اقتصادی ترقی اور معاشرتی بہبودی بھی سب کے لئے یکساں نعمت ثابت ہوگی - انھیں چیزوں کو حاصل کرنے کے جہد کے لئے کانگریس ایک محاذِ عام پیش کرتی ہے کیونکہ یہ ہمیشہ عوام کی بہبودی پر نظر رکھتی ہے - ان کا درد دُکھ سُنتی ہے - ان کو منظم کرتی ہے - ان کو صلاح دیتی ہے - ان کی رہنمائی کرتی ہے اور انھیں سے طاقت حاصل کرتی ہے -

کانگریس چونکہ ایک سیاسی انجمن ہے لہذا مذہبی معاملات سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی - لیکن چونکہ مذہب اور معاشرت اکثر افراد کی زندگی کے اہم جزو ہیں اس لئے ان لوگوں کا کانگریس کا نقطۂ نظر جاننے کی خواہش کرنا جائز اور مناسب ہے - اسی کو محسوس کرتے ہوئے کانگریس نے کراچی میں اور نیز اس کے بعد صاف صاف الفاظ میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ ہر ہندوستانی کے بنیادی حقوق کا یہ لازمی جزو ہوگا کہ وہ جس مذہب کو چاہے اختیار کرے اس کے ضمیر پر کسی قسم کا کوئی جبر نہ ہوگا - اس کی تہذیب معاشرت زبان اور رسم الخط کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا - تمام باشندے چاہے وہ کسی قوم مذہب ، ملت یا جنس کے

ہوں سب کے لئے ایک ہی قانون ہوگا۔ سرکاری ملازمت پیشہ یا تجارت وغیرہ میں کسی کو کسی پر ترجیح نہ دی جائے گی۔ سب کے حقوق یکساں ہوں گے اور انتخابات میں رائے دینے کا حق ہر بالغ کو دیا جائے گا۔

الکشن کے اعلان میں کانگریس یہ عہد دُہرا چکی ہے اور یہی کانگریس کے ہر طرزِ عمل کی بنیاد ہے ۔ یہ اکثریت اور اقلیت دونوں کیلئے یکساں ہے اور یہ بالکل بعید از قیاس ہے کہ کانگریس کبھی اس وعدہ سے مُکر جائے گی اور یہ عہد توڑ دے گی۔

ایسا پُرخلوص قول دینے کے بعد کانگریس مذہبی اور معاشرتی معاملات میں اور زیادہ دخل دینا نہیں چاہتی اور سیاسی جہد میں کوشاں رہتی ہے۔ اس سیاسی جہد میں اس نے ایک بہت بڑی طاقت حاصل کرلی ہے کیونکہ لاکھوں آدمی اس کا ساتھ دے چکے ہیں اس کے پروگرام کی تائید کر چکے ہیں اور اپنی غلامی اور مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے اسی کی طرف نظر کرتے ہیں ۔ یہ پروگرام تمام ہندوستانیوں کے لئے ایک مشترکہ پروگرام ہے جس میں کسی مذہب اور ملت کی قید نہیں ۔ قومی تحریک کے زور پکڑنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ طاقت دو مخالف صفوں میں تقسیم ہوگئی ہے اور آج ہندوستان میں صرف دُو ہی زبردست قوتیں برسرِ پیکار ہیں ۔ ایک طرف کانگریس جو کہ ہندوستانیوں کے جذبۂ وطن پرستی کا ایک نام ہے اور دوسری طرف

برطانوی سامراج - غلط ترجمہ کرنے کی وجہ سے میرے بارے میں اخباروں میں اکثر چھپا ہے کہ میں کہتا ہوں کہ ہندوستان میں صرف دو فریق ہیں - ظاہر ہے کہ یہ غلط ہے کیونکہ چھوٹی بڑی مقتدر اور غیر مقتدر ملا کر لاتعداد جماعتیں ہو سکتی ہیں اور ہیں - میں نے جو کچھ کہا ہے اور جسے میں سچ سمجھتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ آج ہندوستان میں فقط دو سر برآوردہ طاقتیں ہیں ایک کانگریس اور دوسری برطانوی سامراج - باقی ماندہ جب کوئی نازک وقت آتا ہے تو کسی ایک کی طرفدار ہو جاتی ہیں یا ان کی حیثیت محض تماشائیوں کی سی ہوتی ہے اور اس وجہ سے ان کی کوئی اہمیت نہیں مانی جا سکتی - ہم آج سے پیشتر بہت سے سخت معرکے سر کر چکے ہیں اور جیسا کہ ملکوں اور قوموں کا قاعدہ ہے ہم نے ان لڑائیوں سے طاقت اور خود اعتمادی حاصل کی ہے - ایک قوم کی کیفیت اور مصیبت کی بھٹی میں خود کو جلا کر کانگریس کے لوہے نے اپنے آپ کو فولاد بنایا ہے اور موجودہ آب و تاب پائی ہے اور لاکھوں ہندوستانیوں کی محبت اور عقیدت سے مضبوط ہو کر آج اس درجے پر پہونچی ہے - جو لوگ کہ اس سے کنارہ کش رہے اور ایک بیرونی اور ایک نہ ایک دن مٹ جانے والی حکومت کے کمزور سہارے پر بھروسہ کرتے رہے وہ خود ناتوان ہو گئے - اور ان کے کمزور دل و دماغ ایک متحرک قوم کے برقی پیام کا تحمل نہ لا سکے -

محض تعداد یا قانون بنانے والی مجلسوں میں مخصوص نمائندگی کا حق یا باہر والوں کی مدد اور حمایت کسی قوم یا فرقہ کو طاقت نہیں پہونچا سکتی۔ یہ طاقت ایک اندرونی چیز ہے جو ایک مشترکہ جہد میں ساتھیوں کی رفاقت اور اشتراکِ عمل سے حاصل ہوتی ہے۔ ہندوستان کی اقلیتوں کے پنپنے کا دارومدار اُن کی ذاتی صحت اور نشوونما پر ہے نہ کہ کسی دوسرے کے سہارے پر۔ کیا یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی اکثریت بہادر سکھوں کو دبا سکتی ہے حالانکہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ محض ایک سودائی ہی یہ خیال کر سکتا ہے کہ ہندوستان کی کوئی مذہبی اکثریت مسلمانوں پر زبردستی کر سکتی ہے اور ان کے حقوق پامال کر سکتی ہے۔

سیاسی اور اقتصادی معاملات میں کسی جماعت کا محض ایک مذہبی گروہ کی حیثیت سے حصہ لینے کا زمانہ اب گزر گیا ہے۔ ممکن ہے کہ پیشتر ایسا ہو سکتا ہو لیکن آج یہ ناقابل قیاس ہے۔ اب تفرقوں کی نوعیت بدل گئی ہے اور یہ تقسیم آج اقتصادی خطوط پر ہے۔ ایسی صورت میں سیاسی معاملات پر ایک مذہبی گروہ کی حیثیت سے نظر ڈالنا ایک گزرے ہوئے زمانہ کے طرزِ عمل کو اختیار کرنا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سیاسی میدان میں ہندوستان کی مذہبی جماعتیں اس قدر ناکامیاب رہتی ہیں۔ کیونکہ اُن کے پاس کوئی مشترک سیاسی یا اقتصادی نظریہ نہ تو ہے اور نہ ہو سکتا ہے

اُن میں عام طور پر اِن معاملات میں نفاق پیدا ہو جاتا ہے اور اکثر رجعت پسند ان جماعتوں پر قابو پا لیتے ہیں - اندرونی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے وہ لازمی طور پر اپنے سامراجی آقا کے الطاف و عنایات پر نظر رکھتی ہیں اور یہ الطاف خسروانہ کیا ہیں ؟ - چند سرکاری نوکریاں یا اسمبلیوں اور کونسلوں میں چند کرسیاں - اس سے کروڑوں کی بھوک اور ناداری اور لاکھوں کی بے روزگاری کس طرح دور ہو سکتی ہے -

یہ بات رفتہ رفتہ عوام کی سمجھ میں آتی جا رہی ہے اور جو لوگ فرقہ پرست رہنماؤں سے یہ اُمید کرتے تھے کہ وہ ان کا دُکھ درد کسی حد تک دور کر سکیں گے وہ اب ان سے برگشتہ ہو کر کانگریس کی طرف راغب ہوتے چلے جا رہے ہیں اور سیاسی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے معاملات پر غور کرنے لگے ہیں -

ہم اکثر مسلم عوام سے ربط بڑھانے کا تذکرہ کرتے ہیں - ہمارے لئے یہ کوئی نیا پروگرام نہیں ہے - ممکن ہے کہ اس پر از سرِ نو زور دیا جا رہا ہو - یہ تو عوام سے رشتے مضبوط کرنے کا رچا ہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان - سکھ ہوں یا عیسائی) جو ہمارا خاص پروگرام ہے اِس کا فقط ایک جزو ہے - ان سب کا مذہب ان کا ذاتی معاملہ ہے جس کی ضامن کانگریس بن چکی ہے - ہمارے لئے وہ مذہبی گروہ نہیں ہیں بلکہ عوام کی

اس بڑی بھوکی اور مصیبت زدہ جماعت کا ایک جزو ہیں جن کے دلخراش نالے ہر طرف سے آرہے ہیں اور جن کی آہیں فضا میں گونج رہی ہیں۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کانگریس میں ہمیشہ شریک رہی ہے اور اس سے بھی زیادہ افراد کی اس کے طرزِ عمل سے ہمدردی رہی ہے۔ ہمارے سب سے زیادہ با اقتدار رہنماؤں میں کچھ مسلمان رہ چکے ہیں اور اب بھی ہیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ مسلم عوام کا دل لینے میں ہم نے پچھلے چند سالوں میں بہت بے پروائی کی ہے۔ اب ہم اس بھول کی تلافی کرنا چاہتے ہیں اور کانگریس کا پیام اُن تک پہونچانا چاہتے ہیں۔ اس پر اور لوگ کیوں اعتراض کرتے ہیں؟ اگر وہ کانگریس کے سیاسی اور اقتصادی مقصد کے حامی نہیں ہیں تو ان کو پورا اختیار ہے کہ وہ اپنا نظریہ عوام کے سامنے پیش کریں لیکن یہ صدائے احتجاج عوام ہی کے سامنے بلند کرنا چاہیئے۔

اہم بات یہی ہے کہ اپیل عوام سے کی جائے۔ ہمارے نزدیک ہمارے مسائل محض چوٹی کے چند آدمی حل کر نہیں سکتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ پرانی قسم کی آل پارٹیز کانفرنسوں (All Parties Conferences) پر جن میں محض چند فرقوں اور گروہوں کے نمائندے جن کا کوئی مشترکہ سیاسی پس منظر نہیں ہوتا آپس میں ملتے ہیں

اور لڑ جھگڑ کر مباحثہ ختم کر دیتے ہیں) ہمیں کوئی بھروسہ یا اعتبار نہیں رہا ہے۔ ہمیں ان کا کافی تجربہ ہو چکا ہے اور اب اُس تجربے کے دُہرانے کا نہ تو شوق ہے اور نہ تاب۔ ہم اپنی مشکلوں پر مباحثہ اور تبادلۂ خیال کرنے کو ہر وقت تیار ہیں لیکن اُنھیں لوگوں سے جو درحقیقت اُن کا حل چاہتے ہیں چاہے وہ ہمارے متفق ہوں یا نہ ہوں لیکن ان مشکلوں کا حل کسی نام نہاد آل پارٹیز کانفرنس کے ذریعے سے ناممکن ہے۔

جو لوگ کہ کانگریس کا مسلمانوں سے معاہدہ یا سمجھوتا کر لینے کی بات چیت کرتے ہیں وہ کانگریس کا نظریہ سمجھنے میں قطعی طور پر قاصر رہے ہیں اور وہ اُن نئی طاقتوں کا اندازہ لگانے میں بھی جن کی تحریک عوام میں رو نما ہو رہی ہے ناکامیاب رہے ہیں۔ ہم سب لوگ جو قومی اور اقتصادی آزادی چاہتے ہیں آپس میں پہلے ہی ایک مضبوط معاہدہ کر چکے ہیں کہ ہم اس مشترکہ مقصد کے لئے متفق ہو کر جہاد کریں گے۔ اس معاہدہ میں بہت سے مسلمان بھی اُسی طرح شریک ہیں. جیسے ہندو، سکھ یا عیسائی۔ سب بحیثیت ہندوستانی کے اس میں شامل ہیں اور اگر آپس میں کوئی معاملہ تصفیہ طلب ہے (جیسا کہ کبھی کبھی ہونا لازمی ہے) وہ اسے اس بڑی اور باوقعت جماعت میں جسے ہندوستانی عوام کی مرضی کا صحیح اور قابل قدر نمائندہ ہونے کا شرف حاصل ہے مباحثہ کر کے جمہوری طور پر

طے کرلیں گے - کیا یہ طریقہ ایک بیرونی حکومت کے پاس جو ہم کو دبائے ہوئے ہے اور جو ہمیں آپس میں ایک دوسرے سے لڑانا چاہتی ہے وفد لے جانے خوشامد کرنے اور اُس کی عنایات کے طالب ہونے سے زیادہ باعزت اور غیر تمند نہیں ہے - ؟

آزادی حاصل کرنے کے بعد ہمارے لئے یہی ایک جمہوری طریقہ ہے اور جہدِ آزادی کے دَوران میں بھی یہی ایک صورت نظر آتی ہے -

کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ ایسی جماعتیں بنائی جائیں جو نیم مذہبی ہوں اور نیم قوم پرست - مثلاً مسلم کانگریس پارٹی - میرے نزدیک یہ طریقہ غلط ہوگا اور اس سے فرقہ وارانہ ذہنیت اور بڑھے گی اور ہمارے اصلی اور بڑے مقصد کو نقصان پہونچے گا - ایک نیشنلشٹ مسلم پارٹی (Nationlaist Muslim Party) پیشتر بھی بنائی گئی تھی جس کی یاد ہمارے لئے خوشگوار نہیں - ایسی کھچڑیاں تیار کرنے سے اصل نزاع کی صورت بدل جاتی ہے اور عوام چکر میں پڑ جاتے ہیں -

جو لوگ کہ کانگریس کے خلاف ہیں وہ یقیناً اپنی اپنی جماعتیں اور گروہ بنائیں گے - مگر جو لوگ ہمارے موافق ہیں ان کو فقط دروازے تک آکر رُک نہ جانا چاہیے بلکہ قومی ایوان میں اپنا حق سمجھ کر داخل ہونا چاہئے اور قوم کی پالسی وضع کرنے میں ذمہ داری کے ساتھ پورا پورا حصہ لینا چاہیے -

آج کل بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے آپ کو کانگریس والا کہتے ہیں اور جو مکمل آزادی حاصل کرنے کے موافق ہیں۔ لیکن چونکہ وہ فرقہ وارانہ یا دوسری جماعتوں کے ماتحت کام کر رہے ہیں اُن کی طاقت ضائع جا رہی ہے۔

ہندوستان کے عوام کو جلد ہی بہت سے اہم تصفیے جن پر اُن کی قسمت کا دارومدار ہے کرنا پڑیں گے کیونکہ وقت کی نزاکت تیزی کے ساتھ روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے بالفعل بھی یہ چھوٹے چھوٹے جھگڑے اور جھوٹے نزاعات (فرقہ وارانہ وغیرہ) تاریکی میں پیچھے ہٹتے چلے جا رہے ہیں اور اصل سوالات کے بادل جن میں ہماری تقدیر مضمر ہے ہندوستان کیا ساری دنیا پر بڑھتے بڑھتے چھائے جا رہے ہیں۔ ہم چاہے ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا عیسائی ان کا کیا جواب دیں گے؟ کیا ہم تنگ نظری کے صحرا میں گم ہو کر اپنی پُرانی کم ظرفی پر قائم رہیں گے یا متحد ہو کر اور اپنے ارادوں پر مستقل رہ کر آنے والے واقعات کو اپنے مضبوط ہاتھوں سے وضع کریں گے اور اپنے لئے اپنی پسند کی تاریخ لکھیں گے؟

۴ر اپریل ۱۹۳۶ء

(۳)

میں نے مسٹر جناح کا سب میں آخری بیان بہت غور سے پڑھا ہے۔ میں یہ بات اُن کی تسلیم کرتا ہوں کہ مسلم لیگ ایک سیاسی انجمن ہے جو سیاسی میدان میں گامزن ہے۔ لیکن چونکہ وہ ایک مذہبی گروہ تک محدود ہے اس لئے اسی قسم کی اور جماعتوں کی طرح وہ بھی دراصل ایک مذہبی اور فرقہ وارانہ انجمن ہے۔ میں کسی مذہبی جماعت کا محض مذہبی یا معاشرتی معاملات میں رہنمائی کرنا سمجھ سکتا ہوں اور اس کی خدمت کا اعتراف بھی کر سکتا ہوں۔ اسی طرح ایک سیاسی انجمن کا سیاسی طور پر عمل پیرا ہونا بھی میرے قیاس میں آتا ہے چاہے اس کی رائے کچھ بھی ہو۔ لیکن ان دونوں کی کھچڑی تیار کرنا ایک گڑبڑ پیدا کرنا ہے جس کی وجہ سے کسی سوال کا کوئی صحیح تصفیہ نہیں کیا جا سکتا۔ مسٹر جناح یہ فرماتے ہیں کہ مسلم لیگ ایک سیاسی انجمن ہے اور اس کی پالیسی اور پروگرام اکثر بنیادی اور اہم باتوں میں کانگریس کے بالکل خلاف ہے۔ محض ایک مسلمان گھر میں پیدا ہونے سے یا اسلام قبول کر لینے سے کسی شخص کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ مسلم لیگ کے نظریہ اور طرزِ عمل کو بھی تسلیم کرے۔ اگر وہ مسلم لیگ کی پالیسی کا حامی نہیں ہے (جیسے کہ بہت سے مسلمان نہیں ہیں) تو اس کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ کسی دوسری سیاسی جماعت میں شریک ہو جس کے اصول اور مقاصد سے وہ متفق ہو۔ اگر اس نے کانگریس کو پسند کیا

تو وہ اُس میں شریک ہوگا اور اپنا سیاسی جدوجہد اسی کے ماتحت کرے گا۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ مسلمانوں کا بدخواہ ہے یا ان کی تباہی چاہتا ہے۔ وہ محض اپنے خیالات کے مطابق اپنے سیاسی رجحانات کی تکمیل کر رہا ہے جیسے کہ ہر صاحبِ عقل کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں، پارسیوں وغیرہ میں آپس میں بھی شدید سیاسی اختلافات ہیں ان سب مذہبی گروہوں میں کانگریس والے۔ اشتراکیت پسند۔ اشتراکیت کے مخالف۔ کمیونسٹ۔ لبرل۔ باغی۔ انقلاب پسند۔ نرم رو۔ تیز رفتار غرضکہ ہر ایک ذہنیت کے افراد ملیں گے اور اسی طرح اقتصادی معاملات میں بھی ان کی رائے مختلف ہو گی اور یہ مختلف اقتصادی نظاموں کے حامی ہوں گے۔ یہ مختلف رائیں ملک کی مختلف سیاسی اور اقتصادی جماعتوں سے بخوبی ظاہر ہوتی ہیں۔ لیکن مذہب کا نام لے کر ایک ایسی انجمن بنانا جو سیاسی اور اقتصادی معاملات میں بھی دخل دے اور جو ان تمام اصلی بنیادی اور اہم اختلافات کو آڑا کاٹ کر ایک مصنوعی محاذ قائم کرے خلاف حقیقت ہے اور سیاسی اعتبار سے اسے ایک گروہ نہیں کہا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ ایسی جماعت (مسلم لیگ، ہندو سبھا اور سکھ لیگ کی طرح سے) ایک ہم مذہب گروہ کے محض اُس جزو کے نمائندہ ہونے کی دعویدار بن سکتی ہے جو سیاسی اور اقتصادی معاملات میں ہم خیال ہے۔

لیکن یہ نمائندگی بھی صحیح اور صاف طور پر انجام نہیں دے پاتی کیونکہ یہ ہمیشہ اپنے آپ کو کسی مخصوص مذہبی گروہ کے مجموعی مطالبات کا وکیل بن کر پیش کرتی ہے اور اس کے تحفظ کا سوال اُٹھاتی ہے حالانکہ اس مذہب کے افراد کی رائے اور ذہنیت کا جداگانہ ہونا لازمی ہے۔

میں لبرل پارٹی کی پالیسی سے بھی اتفاق نہیں کرتا لیکن کم سے کم میں اسے سمجھ سکتا ہوں۔ یہ سیاسی جماعت ایک مخصوص سیاسی نظریہ کے ماتحت برسرکار ہے اور اس کے دروازے ہندو، مسلمان وغیرہ سب کے لئے یکساں کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن مسلم لیگ اور ہندو سبھا میں اس کی گنجائش نہیں۔

مسٹر جناح اگر یہ سمجھتے ہیں کہ میری نیت اور جماعتوں کو مٹا دینے کی ہے تو انھوں نے دھوکا کھایا ہے اور وہ میرا مقصد سمجھنے میں قاصر رہے ہیں۔ لیکن چونکہ میں کانگریس کی پالیسی اور پروگرام کا پورے طور پر حامی ہوں میں اپنی پوری کوشش کرتا ہوں کہ مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی وغیرہ سب میرے ہم رائے ہوجائیں اور میرے نظریہ کو قبول کرلیں۔ مسٹر جناح یا لبرل حضرات کو اور اسی طرح ہر فرد اور گروہ کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسی طرح عوام کو اپنا ہم خیال بنانے کی پوری پوری کوشش کرے۔ مسٹر جناح کو اس بات کی شکایت کیوں ہے کہ میں مسلمانوں میں کانگریسی مقاصد کی اشاعت کر رہا ہوں اور کانگریس کا پیغام اُن تک پہونچا رہا ہوں؟

یہ اعتراض کوئی سیاسی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ مذہبی ہے اور اسی سے ان کے دماغ کی گتھی ظاہر ہوتی ہے۔ جس وقت مسٹر جناح مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں یا اُن کو کسی بات کرنے سے روکتے یا متنبہ کرتے ہیں اس وقت وہ ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے رہنمائی نہیں کرتے بلکہ ایک مذہبی پیشوا بن کر ہدایت فرماتے ہیں۔ وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ تمام مسلمان لازمی طور پر اُنھیں کے ہم خیال ہوں گے اور جو راہ کہ وہ اختیار کریں گے سب مسلمان اُسی پر آنکھ بند کر کے چلنے لگیں گے۔ یقیناً ایسا فرض کرنا صحیح نہیں اور اس میں دھوکے کی بہت بڑی گنجائش ہے۔

مسٹر جناح سمجھتے ہیں کہ کانگریس کی پالیسی غلط اور قوم کے لئے مضر ہے۔ یہی رائے میری ان کے طرزِ عمل کے بارے میں ہے۔ ہماری رایوں میں اختلاف ہے۔ مناسب تو یہی ہے کہ ہم دونوں اس اختلاف کو تسلیم کر لیں اور جمہوری طور پر اپنے اپنے خیالات اور نظریوں کی اشاعت کریں۔ میں مسٹر جناح کا بڑا پُرجوش استقبال کروں گا اگر وہ کسی خالص سیاسی جماعت کے لیڈر بن کر ملک کے سامنے آئیں جس میں ہر مذہب کے افراد شریک ہو سکتے ہوں اور اپنا مخصوص سیاسی پروگرام پیش کریں۔ ایسی صورت میں سیاسی اور اقتصادی مسائل صاف اور واضح ہو کر ملک کے سامنے آئیں گے اور عوام جن کو ان معاملات پر آخری فیصلہ کرنا ہوگا۔

صحیح نتیجے پر پہونچنے کے لئے مناسب طور پر غور اور فکر کرسکیں گے لیکن مسلمانوں کو محض ایک مذہبی گروہ قرار دے کر ان کے جذبات مشتعل کرنا اور پھر سیاسی معاملات میں ان سے رائے چاہنا ایک کھلا ہوا غلط طریقہ ہے۔ یہ تو وہی پرانے جاگیردارانہ زمانے کا نقطۂ نظر ہے جب کہ سیاسی اور اقتصادی معاملات پر کوئی نظر نہ کرتا تھا لیکن آج کی دنیا میں اس کا نبھنا ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے جو میں یہ کہتا ہوں کہ میرے لئے فرقہ وارانہ ذہنیت سے معاملات پر نظر ڈالنا آسان نہیں۔

مسٹر جناح کا یہ کہنا بھی بالکل بعید از انصاف ہے کہ کانگریس اقلیتوں کی پاسداری اور ان کے حقوق کے تحفظ کا خیال کرنا محض ایک پرلے سرے کی حماقت سمجھتی ہے۔ سچ بات بالکل اس کے برعکس ہے۔ جہانتک کہ مذہب تہذیب اور زبان کا سوال ہے (اور عام طور پر اقلیتوں کے یہی بنیادی حقوق سمجھے جاتے ہیں) کانگریس جتنا کہ پرخلوص اعلانات سے کیا جاسکتا ہے ان کی پورے طور پر ضامن اور محافظ بن چکی ہے۔ ان کے علاوہ ممکن ہے کہ اور سوالات بھی غور طلب ہوں اور یقیناً اس کوتاہ بین اور ناقص دنیا میں ایسے اکثر موقعے پیشتر بھی آئے ہیں اور آئندہ بھی آئیں گے جب اقلیتوں کے حقوق کے متعلق کوئی سمجھوتا کرلینا ہی پسندیدہ ہوگا۔ کانگریس اس بات کی اہمیت بخوبی سمجھتی ہے اور جب کبھی ایسے موقعے

آتے ہیں وہ ایسا سمجھوتا کرا دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتی ہے لیکن سیاسی سمجھوتے ایک بنیادی سیاسی پالیسی کے ماتحت ہی ہو سکتے ہیں۔ بنیادی اصولوں کو توڑ کر کسی جزوی نزاع کو طے کر لینا سمجھوتا کرنا نہیں ہوا۔ یہ تو اپنی ساری تعمیر کی اپنے ہاتھوں خود بنیاد کھودنا ہے اور ذہنی توازن کا پورے طور پر کھو دینا ہے۔

کانگریس کمیونل اوارڈ (Communal Award) فرقہ وارانہ تصفیہ کو نہ قبول کرتی ہے اور نہ قبول کر سکتی ہے کیونکہ یہ ایک متحد ہندوستان اور جمہوریت کے بنیادی اصولوں کے بالکل خلاف ہے۔ اس کو آزادی کا ضد سمجھنا چاہئے۔ لیکن مسٹر جناح یہ بھی جانتے ہیں کہ کانگریس کی پالیسی یہ ہے کہ متعلقہ فرقوں کو ہم خیال بنا کر اور ان کی خوشنودی اور اشتراک عمل حاصل کر کے اس فیصلہ کو تبدیل کرائے"۔

جس وقت مسٹر جناح یہ فرماتے ہیں کہ مسلم لیگ کا کانگریس سے بہت سی اہم اور بنیادی سیاسی باتوں میں شدید اختلاف ہے تو کیا وہ یہ امید کرتے ہیں کہ کانگریس اور وہ مسلمان جو کانگریس کے متفق ہیں مسلم لیگ کا لحاظ کر کے اپنی سالہا سال کی پالیسی چھوڑ دیں جو منارۂ ساحل کہ ایک مدت سے اُن کی رہنمائی کر رہا ہے اس کی روشنی بجھا دیں اور جس مقصد کے لئے اُن میں سے ہزارہا افراد مصیبتوں کے ظلمات کی تاریک اور پُر خار وادیوں سے گذرے ہیں

وہ دل سے بھلا دیں۔ مسٹر جناح بخوبی جانتے ہیں کہ ہماری مصیبت کے وقت جبکہ ہم ایک مغرور سامراج کا مقابلہ کر رہے تھے مسلم لیگ کے بہت سے سر برآوردہ رہنما انگلستان کی کنزرویٹو پارٹی (Conservative Party) کے کٹر لیڈروں سے جن سے زیادہ ہندوستان کی آزادی کا کوئی دشمن نہیں ساز کر گئے تھے۔ کیا ہم لوگ جنھوں نے کہ اس سامراج کی زبردست اور ہولناک طاقت کو آمادۂ پیکار دیکھ کر بھی سر نہیں جھکایا اور جو جہد آزادی میں ہر قسم کی تازہ مصیبت جھیلنے اور قربانی کرنے کے لئے تیار ہیں کیونکہ یہی ان کی زندگی کا ایک مقصد ہے ان وطن فروشوں کے سامنے گردن نیچی کر سکتے ہیں؟۔

مسٹر جناح نے میرے عقیدۂ اشتراکیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں سامراجی حکومتوں کا خاتمہ چاہتا ہوں اور محض ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں ایک اشتراکیت قائم ہونے کا متمنی ہوں میں ایک ایسے دنیاوی نظام کا قائل ہوں جو اشتراکیت کے اصولوں پر مبنی ہو اور مجھے یقین ہے کہ ہماری بدمزاجیاں اور مصیبتیں صرف اسی طرح ہمیشہ کے لئے دور ہو سکتی ہیں۔ لیکن ابھی کانگریس کا تو یہ عقیدہ یا پالیسی نہیں ہے۔ تاہم کانگریس عوام کا مفاد مدِ نظر رکھتی ہے انھیں سے طاقت حاصل کرتی ہے۔ اس لئے اس کی رائے میں اقلیتوں سے سیاسی سمجھوتے کرنا اسی وقت مناسب اور

دیر پا ہوں گے جبکہ عوام اس مباحثہ میں شریک ہوں اور اپنے مطالبات خود پیش کریں۔

کیا میرے طرزِ گفتگو میں کوئی نادر شاہی انداز ہے؟ یہ تو دوسروں کے طے کرنے کی بات ہے۔ لیکن کیا میں مسٹر جناح سے یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ جس وقت وہ مسلمانوں تک کانگریسی پیام پہونچانے پر ہم سے خفا ہوتے ہیں یا تمام مسلمانوں کو بغیر اس کا خیال کئے کہ ان کی سیاسی رائے یا رجحان کیا ہے ہمارے خلاف متنبہ کرتے ہیں اور فتوے جاری کرتے ہیں اس وقت یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ان میں ایک ہٹلریت کی آن آجاتی ہے؟

۲ رمئی ۱۹۳۷ء

دو مسجدیں

[یہ مضمون پنڈت جواہر لال نہرو نے الموڑہ جیل میں اگست ۱۹۳۵ء میں ہندوستانی میں لکھا تھا ان کے مضامین کا ایک مجموعہ پٹنہ سے ہندی میں شائع ہو چکا ہے اور یہ مضمون اس میں موجود ہے۔ مجموعہ شائع کرنے والوں نے ہندی پڑھنے والوں کے خیال سے کہیں کہیں پنڈت جی کے اصلی مضمون کے الفاظ کو ہندی الفاظ سے بدل دیا تھا۔ میں نے یہ مضمون اُسی ہندی مجموعہ سے لیا ہے اور کہیں کہیں ہندی الفاظ کے بجائے عام فہم اُردو الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس طرح میرا خیال ہے کہ اب یہ مضمون اصل کے قریب قریب مطابق ہو گیا ہے۔ بدقسمتی سے پنڈت جی کے پاس اصل مضمون کی کوئی کاپی موجود نہ تھی ورنہ مجھے خواہ مخواہ دخل دینے کی کوئی ضرورت پیدا نہ ہوتی]۔

آج کل اخباروں میں لاہور کی شہید گنج والی مسجد کا آئے دن کچھ نہ کچھ چرچا ہوتا ہے - شہر میں کافی کھلبلی مچی ہوئی ہے - دونوں طرف مذہبی جوش دکھائی دیتا ہے - ایک دوسرے پر حملے ہوتے ہیں - ایک دوسرے کی بدنیتی کی شکایتیں ہوتی ہیں - اور بیچ میں ایک پنچ کی طرح انگریزی حکومت اپنی طاقت دکھلاتی ہے - مجھے نہ تو واقعات ہی ٹھیک معلوم ہیں کہ کس نے یہ سلسلہ پہلے چھیڑا تھا یا کس کی غلطی تھی اور نہ اس کی جانچ کرنے کی میری کوئی خواہش ہی ہے - اس طرح کے مذہبی جوش میں مجھے بہت دلچسپی بھی نہیں ہے - لیکن دلچسپی ہو یا نہ ہو پر جب بدقسمتی سے یہ جوش پیدا ہو جائے تو اس کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے - میں سوچتا ہوں کہ ہم لوگ اس دیش میں کتنے پچھڑے ہوئے ہیں کہ ادنیٰ ادنیٰ سی باتوں پر جان دینے کو آمادہ ہو جاتے ہیں پر اپنی غلامی اور فاقہ مستی سہنے کو تیار رہتے ہیں -

اس مسجد سے میرا دھیان بھٹک کر ایک دوسری مسجد کی طرف جا پہونچا وہ ایک بہت مشہور تاریخی مسجد ہے اور قریب چودہ سو ۱۴۰۰ برس سے اس کی طرف لاکھوں کروڑوں نگاہیں دیکھتی آئی ہیں - وہ اسلام سے بھی پرانی ہے اور اس نے اس لمبی زندگی میں نہ جانے کتنی باتیں دیکھی ہیں - اس کے سامنے بڑے بڑے سامراج گرے، پرانی سلطنتیں تباہ ہوئیں، مذہب بدلے، خاموشی سے اس نے یہ سب دیکھا اور ہر انقلاب اور تبدیلی پر اس نے اپنی پوشاک بھی بدلی -

چودہ سو برس کے طوفانوں کو اس عالیشان عمارت نے برداشت کیا۔ بارش نے اس کو دھویا۔ ہوا نے اپنے بازوؤں سے اس کو رگڑا۔ مٹی نے اس کے بعض حصوں کو ڈھانکا۔ بزرگی اور شان اس کے ایک ایک پتھر سے ٹپکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں دنیا بھر کا تجربہ اسس ڈیڑھ ہزار سال نے بھر دیا ہے۔ اتنے لمبے زمانے تک قدرت کے کھیلوں اور طوفانوں کی برداشت مشکل تھی لیکن انسانوں کی حماقتوں اور وحشتوں کا سہنا اس سے بھی زیادہ کٹھن تھا۔ لیکن اس نے یہ بھی سہا۔ اس کے پتھروں کی خاموش نگاہوں کے سامنے سلطنتیں بنیں اور بگڑیں۔ مذہب اُٹھے اور بیٹھے۔ بڑے سے بڑے بادشاہ۔ خوبصورت سے خوبصورت عورتیں۔ لائق سے لائق آدمی چمکے اور اپنا راستہ ناپ کر غائب ہو گئے۔ ہر طرح کی ہمت اور بہادری ان پتھروں نے دیکھی اور ہر قسم کی بزدلی اور کمینہ پن بھی دیکھا۔ بڑے اور چھوٹے اچھے اور بُرے سب آئے اور چل بسے لیکن یہ پتھر ابھی قائم ہیں۔ آج بھی یہ پتھر اپنی اونچائی سے انسانوں کی بھیڑوں کو دیکھ کر اپنے دل میں کیا سوچتے ہوں گے؟ ان کے بچوں کے کھیل۔ ان کے بڑوں کی لڑائی۔ فریب اور بیوقوفی۔ ہزاروں برس میں انھوں نے کتنا کم سیکھا۔ کتنے دن اور لگیں گے کہ ان کو عقل اور سمجھ آئے۔

سمندر کی ایک پتلی سی بانہہ (آبنائے) ایشیا اور یورپ کو وہاں الگ کرتی ہے۔

ایک چوڑی ندی کی طرح باسفورس (Bosphorus) بہتا ہے اور دو دنیاؤں کو جدا کرتا ہے ۔ اس کے یورپ والے کنارے کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر بائزنیٹم (Byzantium) کی پرانی بستی تھی ۔ بہت دنوں سے وہ رومن سلطنت میں شامل تھی جس کی پوربی سرحد عیسوی کے شروع کی صدیوں میں عراق تک تھی ۔ لیکن پورب کی طرف سے اس سلطنت پر اکثر حملے ہوتے تھے ۔ روم کی طاقت کچھ کم ہو رہی تھی اور وہ اپنی دور دور کی سرحدوں کی ٹھیک طرح حفاظت نہیں کر سکتا تھا ۔ کبھی پچھم اور اُتر میں جرمن وحشی (جیسا کہ رومن لوگ انھیں کہتے تھے) چڑھ آتے تھے اور ان کا ہٹانا مشکل ہو جاتا تھا ۔ اور کبھی پورب میں عراق کی طرف سے یا عرب سے ایشیائی لوگ حملے کرتے اور رومن فوجوں کو ہرا دیتے تھے ۔

روم کے شہنشاہ کانسٹن ٹائن (Constan tine) نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی راجدھانی پورب کی طرف لے جائے تاکہ پوربی حملوں سے سلطنت کی حفاظت کر سکے ۔ اس نے باسفورس (Bosphorus) کے سندر کنارے کو چُنا اور بائزنیٹم (Byzantium) کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر ایک بڑا شہر بسایا ۔ عیسوی کی چوتھی صدی ختم ہونے والی تھی جب قسطنطنیہ کا جنم ہوا ۔ اس نئے بندوبست سے رومن سلطنت

پورب میں ضرور مضبوط ہوگئی لیکن اب پچھم کی سرحد اور بھی دور پڑ گئی۔ کچھ دن بعد رومن سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک پچھمی سلطنت اور ایک پوربی سلطنت۔ کچھ برس بعد پچھمی سلطنت کو اس کے دشمنوں نے ختم کر دیا لیکن پوربی سلطنت ایک ہزار برس سے زائد اور قائم رہی اور بائزینٹین سامراج (Byzantine Empire) کے نام سے مشہور رہی۔

شہنشاہ کانسٹن ٹائن نے صرف راجدھانی ہی نہیں بدلی بلکہ اس سے بھی بڑی ایک تبدیلی کی۔ اس نے عیسائی دھرم قبول کیا۔ اس کے پہلے عیسائیوں پر روم میں بہت سختیاں ہوتی تھیں۔ جو ان میں سے روم کے دیوتاؤں کو نہیں پوجتا تھا یا شہنشاہ کے بُت کی پرستش نہیں کرتا تھا اس کو موت کی سزا مل سکتی تھی۔ اکثر اُسے ایک گھرے میدان میں بھوکے شیروں کے سامنے پھینک دیا جاتا تھا۔ یہ روم کی جنتا کی ایک بہت بڑی تفریح تھی۔ روم میں عیسائی ہونا ایک بڑے خطرے کی بات تھی۔ وہ تو باغی سمجھے جاتے تھے۔ اب یکایک زمین آسمان کا فرق ہو گیا۔ شہنشاہ خود عیسائی ہو گیا اور عیسائی دھرم سب سے زائد عزت کے قابل سمجھا جانے لگا۔ اب بیچارے پُرانے دیوتاؤں کے پوجنے والے مشکل میں پڑ گئے اور بعد کے شہنشاہوں نے تو ان کو بہت ستایا۔ صرف ایک شہنشاہ جولین (Julian)

پھر ایسے ہوئے جو عیسائی دھرم کو چھوڑ کر پھر دیوتاؤں کے پجاری بن گئے۔ لیکن اس وقت عیسائی مذہب بہت زور پکڑ چکا تھا اس لئے بیچارے روم اور یونان کے پرانے دیوتاؤں کو جنگل کی پناہ لینی پڑی اور وہاں سے بھی وہ دھیرے دھیرے نکال دیے گئے۔

اس پوربی رومن سلطنت کے مرکز قسطنطنیہ میں شہنشاہوں کے حکم سے بڑی بڑی عمارتیں بنیں اور بہت جلدی وہ ایک بڑا شہر ہو گیا۔ اس وقت یورپ میں کوئی بھی دوسرا شہر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ روم بھی بالکل پچھڑ گیا تھا۔ یہاں کی عمارتیں ایک نئے طرز کی بنیں اور ایک نئے فن تعمیر کی بنیاد پڑی جس میں محراب۔ گنبد۔ برج اور ستون وغیرہ نئی طرح کے تھے اور جس کے اندر دیواروں اور کھمبوں پر باریک پچہ کاری کا کام ہوتا تھا۔ یہ فن تعمیر بازنٹین آرکیٹکچر (Byzantian Archi tecture) کے نام سے موسوم ہوا۔ چھٹی صدی عیسوی میں قسطنطنیہ میں ایک عالیشان گرجا جو کہ اسی فن تعمیر کا ایک لاجواب نمونہ ہے بنایا گیا اور یہ سینکٹا صوفایا (Sancta Sophia) یا سینٹ صوفایا کے نام سے مشہور ہوا۔

پوربی رومن سلطنت کا یہ سب میں بڑا گرجا تھا اور شہنشاہوں کی یہ آرزو تھی کہ اپنی شان اور عظمت میں یہ گرجا بے نظیر بنے اور اُن کی شہنشاہیت کے

شایاں ہو۔ ان کی مراد پوری ہوئی اور یہ گرجا بازنٹین آرٹ کی سب سے بڑی فتح (شاہکار) سمجھا جاتا ہے۔ بعد میں عیسائی مذہب کے دو ٹکڑے ہو گئے (ہونے کو تو کئی ہوئے لیکن دو بڑے ٹکڑوں کا ذکر ہے) اور روم اور قسطنطنیہ میں مذہبی لڑائی چھڑی۔ وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ روم کا بڑا پادری پوپ ہو گیا اور یورپ کے پچھمی دیشوں میں وہ بڑا مانا جانے لگا لیکن پوربی رومن سلطنت نے اس کو نہیں مانا اور وہاں کا عیسائی فرقہ الگ ہو گیا۔ یہ فرقہ آرتھوڈاکس چرچ (Ortho dox Church) کہلایا جانے لگا یا اکثر یونانی چرچ بھی کہلاتا تھا کیونکہ یہاں کی زبان یونانی ہو گئی تھی۔ یہ آرتھوڈاکس چرچ روس اور اس کے آس پاس بھی پھیلا تھا۔

سینٹ صوفایا کا گرجا گھر چرچ کا مرکز تھا اور نو سو برس تک وہ ایسا ہی رہا۔ بیچ میں ایک دفعہ روم کے طرفدار عیسائی (جو مسلمانوں سے جہاد کرنے آئے تھے) قسطنطنیہ پر ٹوٹ پڑے اور اس پر انھوں نے قبضہ بھی کر لیا لیکن وہ جلدی ہی نکال دیے گئے۔

آخر میں جب پوربی سلطنت ایک ہزار برس سے زیادہ چل چکی تھی اور سینٹ صوفایا کی عمر بھی لگ بھگ نو سو سال کی ہو رہی تھی تب ایک نیا حملہ ہوا جس نے اس پرانی شہنشاہیت کا خاتمہ کر دیا۔ پندرھویں صدی عیسوی میں عثمانوی ترکوں نے قسطنطنیہ پر فتح پائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کا جو سب سے بڑا

عیسائیوں کا گرجا تھا وہ اب سب سے بڑی مسجد ہو گیا۔ سینٹ صوفایا کا نام آیہ صوفیہ پڑ گیا۔ اس کی یہ نئی زندگی بھی لمبی نکلی (سیکڑوں برسوں کی) ایک طرح سے وہ عالی شان مسجد ایک ایسی نشانی بن گئی جس پر دور دور سے نگاہیں آکر ٹکراتی تھیں اور بڑے بڑے منصوبے گانٹھتی تھیں۔ انیسویں صدی میں ترکی شہنشاہیت کمزور ہو رہی تھی اور روس بڑھ رہا تھا۔ روس اتنا بڑا دیش ہوتے ہوئے بھی ایک بند دیش تھا اس کی سلطنت بھر میں کوئی ایسا کھلا بندرگاہ نہیں تھا جو سردیوں میں برف سے خالی رہے اور کام آسکے۔ اس لئے وہ قسطنطنیہ کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ دل آویز پرانے روحانی اور معاشرتی رشتے تھے۔ روس کے زار اپنے آپ کو پوربی رومن شہنشاہیت کے وارث سمجھتے تھے اور ان کی پرانی راجدھانی کو اپنے قبضے میں لانا چاہتے تھے۔ دونوں کا مذہب وہی آرتھوڈاکس گریک چرچ تھا جس کا نامی گرجا سینٹ صوفایا تھا۔ روس کو اس کی تاب نہ تھی کہ اس کے مذہب کا سب سے پرانا بڑا اور مشہور گرجا مسجد بنا رہے۔ اس کے اوپر جو ہلال بنا ہوا تھا وہ اس کی نگاہوں میں کھٹکتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس کے بجائے گریک کراس (یونانی صلیب) یہاں لگایا جائے۔

دھیرے دھیرے انیسویں صدی میں زاروں کا روس قسطنطنیہ کی طرف بڑھتا گیا۔ جب قریب آنے لگا تو یورپ کی اور طاقتیں گھبرائیں۔ انگلستان

اور فرانس نے رکاوٹیں ڈالیں - لڑائی ہوئی اور روس کچھ رُکا - لیکن پھر وہی کوشش جاری ہوگئی اور پھر وہی سیاسی داؤں پیچ چلے جانے لگے - آخرکار ۱۹۱۴ء کی بڑی لڑائی شروع ہوئی اور اس میں انگلستان - فرانس - روس اور اٹلی میں خفیہ سمجھوتے ہوئے - دنیا کے سامنے تو آزادی اور چھوٹے دیشوں کے خودمختار قائم رہنے کے اعلیٰ مقصد رکھے گئے لیکن پردے کے پیچھے گِدھوں کی طرح لاش کے انتظار میں اُس کے بٹوارے کے منصوبے طے کیے گئے -

پر یہ منصوبے بھی پورے نہیں ہوئے - اِس لاش کے ملنے سے پہلے زاروں والا روس ہی ختم ہوگیا - وہاں انقلاب آیا اور حکومت اور سماج دونوں ہی کا تختہ پلٹ گیا - بالشوکوں نے تمام پُرانے خفیہ سمجھوتے یہ دکھانے کو کہ یورپ کی بڑی بڑی سامراجی طاقتیں کتنی دھوکے باز ہیں ظاہر کر دیئے - ساتھ ہی اس بات کا اعلان بھی کر دیا کہ وہ (بالشوک) شہنشاہیت کے خلاف ہیں اور کسی دوسرے دیش پر اپنا اختیار نہیں جمانا چاہتے اور ہر قوم کو آزاد رہنے کا حق ہے -

یہ صفائی اور نیک نیتی پچھم کی جیتنے والی طاقتوں کو پسند نہیں آئی - اُن کی رائے میں خفیہ ارادوں کا ڈھنڈورا پیٹنا شرافت کی نشانی نہیں تھا - اور اگر روس کی نئی حکومت نالائق نکلی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اپنے اچھے شکار سے ہاتھ دھو بیٹھیں - انھوں نے (خاصکر انگریزوں نے) قسطنطنیہ پر قبضہ کیا -

چار سو چھیاسی سال بعد اس پُرانے شہر کی حکومت اسلامی ہاتھوں سے نکل کر پھر عیسائی ہاتھوں میں آئی۔ سلطان اور خلیفہ ضرور موجود تھے لیکن وہ ایک گڈّے کی مانند تھے۔ جدھر موڑ دیے جائیں اُدھر ہی گھوم جاتے تھے۔ آیہ صوفیہ بھی حسبِ معمول کھڑی تھی اور مسجد تھی لیکن اس کی وہ شان کہاں جو آزاد وقت میں تھی جب خود سلطان اس میں جمعہ کی نماز پڑھنے جاتے تھے۔ سلطان نے سر جھکایا۔ خلیفہ نے غلامی تسلیم کی لیکن چند ترک ایسے تھے جن کو یہ قبول نہ تھا۔ ان میں سے ایک مصطفےٰ کمال تھا جس نے غلامی سے بغاوت کو بہتر سمجھا۔

اس عرصہ میں قسطنطنیہ کے ایک اور وارث اور حقدار پیدا ہوئے۔ یہ یونانی لوگ تھے۔ لڑائی کے بعد یونان کو مفت میں بہت سی زمین ملی اور وہ پرانی یوربی رومن سلطنت کے خواب دیکھنے لگا۔ ابھی تک روس راستے میں تھا اور ترکی تو موجود ہی تھا۔ اب روس مقابلے سے ہٹ گیا اور ترک ہارے ہوئے پریشان پڑے تھے۔ راستہ صاف معلوم ہوتا تھا۔ انگلستان اور فرانس کے بڑے بڑے آدمیوں کو بھی راضی کر لیا گیا۔ پھر دِقّت کیا رہی؟

لیکن ایک بڑی دقت تھی اور وہ دِقّت تھی مصطفےٰ کمال پاشا۔ اس نے یونانی حملہ کا مقابلہ کیا اور اپنے دیش سے یونانی فوجوں کو بُری طرح ہرا کر نکالا۔ اس نے سلطان خلیفہ کو جس نے اپنے ملک کے دشمنوں کا ساتھ دیا تھا

ایک غدار کہہ کر نکال دیا اس نے ملک سے سلطنت اور خلافت دونوں کا سلسلہ ہی مٹا دیا۔ اس نے اپنے گرے اور تھکے ہوئے ملک کو ہزار دشواریوں اور دشمنوں کے سامنے کھڑا کیا اور اس میں پھر نئی روح پھونک دی۔ سب سے بڑی تبدیلیاں جو اس نے کیں وہ مذہبی اور معاشرتی تھیں۔ عورتوں کو پردے سے باہر نکال کر قوم میں سب سے آگے رکھا۔ اس نے مذہبی تعصب کو بالکل کچل دیا اور کٹر پنے کو سر اٹھانے نہ دیا۔ اس نے سب میں نئی تعلیم پھیلائی اور ہزاروں برس کے پُرانے رواجوں اور طریقوں کو ختم کر دیا۔

پُرانی راجدھانی قسطنطنیہ کو بھی اس نے اس عظمت سے گرا دیا۔ ڈیڑھ ہزار برس سے وہ دو بڑی سلطنتوں کی راجدھانی رہی تھی۔ اب ایشیا میں انگورا (ایک چھوٹا سا شہر لیکن ترکوں کی نئی طاقت کا ایک نمونہ) کو راجدھانی بنایا۔ قسطنطنیہ کا نام بھی بدل گیا۔ اب اس کا نام اسطنبول ہو گیا۔

اور آیہ صوفیہ؟ اس کا کیا حشر ہوا؟ وہ چودہ سو برس کی عمارت اسطنبول میں کھڑی ہے اور زندگی کے اونچ نیچ کو دیکھتی جاتی ہے۔ نو سو برس تک اس نے یونانی مسیحی گانے سُنے اور طرح طرح کی خوشبوئیں جو یونانی پوجا میں جلائی جاتی ہیں سونگھیں۔ پھر چار سو اسّی برس تک عربی اذان کی آواز اس کے کانوں میں گونجی اور نماز پڑھنے والوں کی قطاریں اس کے پتھروں پر کھڑی ہوئیں۔

اور اب !

ایک دن کچھ مہینوں کی بات ہے (اسی سال ۱۹۳۵ء میں) غازی مصطفےٰ کمال پاشا (جن کو اب خاص خطاب اور نام اتاترک کا دیا گیا ہے) کے حکم سے آیہ صوفیہ مسجد نہیں رہی - بغیر کسی دھوم دھام کے وہاں کے مجاور ہٹا دیے گئے اور دوسری مسجدوں میں بھیج دیے گئے - اب یہ طے ہوا کہ آیہ صوفیہ بجائے مسجد کے ایک عجائب گھر ہو خصوصاً بازنٹین (Byzantian) فنون کی - بازنٹین زمانہ ترکوں کے آنے سے پہلے کا مسیحی زمانہ تھا - ترکوں نے قسطنطنیہ پر ۱۴۵۲ء میں قبضہ کیا تھا - اُس وقت سے سمجھا جاتا ہے کہ بازنٹین آرٹ ختم ہو گیا - اس لئے اب آیہ صوفیہ ایک طریقہ سے پھر عیسائی زمانے کو واپس چلی گئی - کیوں ! مصطفےٰ کمال کے حکم سے -

آج کل وہاں زوروں سے کھُدائی ہو رہی ہے - جہاں جہاں مٹی جم گئی تھی ہٹائی جا رہی ہے اور پُرانی پچہ کاری نکل رہی ہے - بازنٹیں آرٹ کے جاننے والے امریکہ اور جرمنی سے بلائے گئے ہیں اور انھیں کی نگرانی میں کام ہو رہا ہے - پھاٹک پر عجائب خانہ کی تختی لٹک رہی ہے اور دربان بیٹھے ہیں ان کو آپ اپنی چھتری چھڑی دیجئے ان کا ٹکٹ لیجئے اور اندر جا کر اس پُرانے مشہور آرٹ کے نمونے دیکھئے اور دیکھتے دیکھتے اس دنیا کی عجیب و غریب تاریخ پر غور کیجئے - اپنے دماغ کو ہزاروں سال آگے پیچھے دَوڑا لیے -

کیا کیا تصویریں - کیا کیا تماشے - کیا کیا جوانمردیاں - کیا کیا ظلم آپ کے سامنے آتے ہیں - ان دیواروں سے کہئے کہ وہ آپ کو اپنی کہانی سنائیں - اپنے تجربے آپ کو دے دیں - شاید کل اور پرسوں جو گذر گئے ان پر غور کرنے سے ہم آج کو سمجھیں اور آنے والے کل اور پرسوں کے پردوں کو بھی ہٹا کر ہم جھانک سکیں۔

لیکن وہ پتھر اور دیواریں خاموش ہیں - انھوں نے اتوار کی مسیحی پوجا بہت دیکھی اور جمعہ کی مسلمانی نمازیں بھی بہت سنیں - اب اُن کے سایہ میں روزانہ کی نمائش ہے - دنیا بدلتی رہی لیکن وہ قائم ہیں - ان کے گھسے ہوئے چہرہ پر کچھ ہلکی سی مسکراہٹ معلوم ہوتی ہے اور ایک دھیمی سی آواز کانوں میں آتی ہے۔

"انسان بھی کتنا بیوقوف اور جاہل ہے کہ وہ ہزاروں برس کے تجربے سے نہیں سیکھتا اور بار بار وہی حماقتیں دُہراتا چلا جاتا ہے"۔

ایک جج کی ذہنیت[1]

آج مجھے اپنی وکالت کا زمانہ ایک بھولا ہوا خواب سا معلوم ہوتا ہے اور میرے لئے اس وقت کے خیالات احساسات اور دماغی کیفیات کی یاد تازہ کرنا اب کسی قدر دشوار ہو گیا ہے - حالانکہ قانون کے جال سے نکلے ہوئے (ایک سے زائد اعتبار سے) مجھے ابھی صرف سولہ ہی سال ہوئے ہیں - کبھی کبھی میں اُن دنوں کو یاد کرتا ہوں کیونکہ قید خانہ میں انسان پُرانی باتوں کو سوچنے لگتا ہے اور چونکہ موجودہ زمانہ بے رنگ - یکساں اور رنج وغم سے پُر ہوتا ہے لہذا عہدِ ماضی کے نقوش اور بھی زیادہ رنگین شوخ اور جاذب نظر بن کر اُبھرتے ہیں - میرے ماضی وکالت میں شاید ہی کوئی چیز قابل توجہ ہو اور آج تک میرے دل میں اُس کی طرف مڑ کر نظر ڈالنے کی خواہش کبھی پیدا نہیں ہوئی

---

[1] یہ مضمون جیل خانہ میں ستمبر ۱۹۳۵ء میں لکھا گیا تھا اور پہلے پہل ماڈرن ریویو (Modern Review) میں شائع ہوا تھا -

پھر بھی میرا دماغ اکثر اس زمانہ کے امکانات کے متعلق خیال آرائیاں کرتا ہے۔ (جب انسان مجبوراً بیکار ہو تو یہ ایک انتہائی دلچسپ شغل بیکاری ہے گو احمقانہ ضرور ہے) اور میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر میں نے وکالت چھوڑ نہ دی ہوتی تو زندگی میرے ساتھ کیا سلوک کرتی اور میری کس طرح گزر ہو رہی ہوتی۔ اُس وقت کے لئے یہ کوئی ایسی خلاف قیاس بات بھی نہ تھی گو اب عجیب سی ضرور معلوم ہوتی ہے۔ قسمت کے تاگے کا ایک ذرا سا بل زندگی کے مستقبل کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں وکالت کرتا ہوتا تو بحیثیت وکیل کے غالباً میرا شمار کامیاب وکیلوں میں ہوتا اور موجودہ زندگی کے مقابلہ میں میری حیات بہت زیادہ سکون بخش سادہ بے رنگ اور جسمانی آسائش کے اعتبار سے کہیں زیادہ پُر عیش اور آرام دہ ہوتی۔ ممکن ہے کہ شاید میں بھی اپنے بہت سے پُرانے دوستوں اور ساتھیوں کی طرح سفید بالوں والی ٹوپی اور کالے گاون سے آراستہ ہو کر ایک نہایت معزز اور سنجیدہ صورت جج بن گیا ہوتا۔

بہ حیثیت جج کے میرے احساسات کیا ہوتے اس بارے میں میں نے اکثر غور کیا ہے۔ ایک جج کا دل و دماغ کس طرح کام کرتا ہے؟ یہ دوسرا سوال تو ایام وکالت میں بھی کسی حد تک میرے دماغ میں چکر لگایا کرتا تھا خصوصاً جبکہ میں خود فوجداری کے مقدموں کی پیروی کرتا یا ان کو دیکھتا تھا اور جس

تیزی اور ظاہرا لاپرواہی سے عدالتیں ملزموں کو پھانسی کی یا لمبی لمبی قید کی سزائیں دیتی تھیں ان کو سُن کر مجھ پر ایک سکتہ کا عالم طاری ہو جاتا تھا اور میں اکثر خیال میں گم ہو جاتا تھا۔ یہی سوال اس سے بھی زیادہ ذاتی طور پر میرے سامنے اس وقت آتا تھا جبکہ میں خود ملزم کی حیثیت سے قیدیوں کے کٹھرہ میں حکم سننے کے لئے کھڑا ہوتا تھا یا کسی سیاسی جرم پر اپنے کسی دوست کا مقدمہ دیکھنے عدالت جاتا تھا۔ اور جیل خانہ میں تو یہ سوال قریب قریب ہر وقت میرے پیشِ نظر رہتا ہے کیونکہ یہاں تو میرے اردگرد سیکڑوں بلکہ ہزاروں ایسے قیدی ہیں جن کو ججوں نے یہاں بھیجا ہے (اس وقت میرا مطلب عام قیدیوں سے ہے اور فقط سیاسی قیدیوں کی طرف اشارہ نہیں ہے) جج نے تو محض ملزم کے مجرمانہ فعل پر شہادت کے اعتبار سے غور کیا اور قانون تعزیرات کے مطابق اُسے سزا دی۔ کبھی کبھی غالباً کسی خاص سخت سزا کو جائز ثابت کرنے کے لئے اس نے فیصلہ میں اپنا ایک وعظ بھی جوڑ دیا۔ اس نے مجرم کے ماحول اور اس کی تعلیم و تربیت (عدم تعلیم و تربیت کہنا چاہیئے) کی طرف کوئی خیال نہیں کیا۔ اُس نے کٹہرے میں کھڑے ہونے والے اُس گونگے اور خوفزدہ انسان کی دماغی کشمکش کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور نہ اُس نے اُس نفسیاتی پس منظر ہی کی طرف نگاہ کی جو غالباً دراصل ارتکاب جرم کا باعث تھا۔ اس کے دل میں تو شاید کبھی یہ شبہ بھی پیدا نہ ہوا کہ وہی تہذیب و تمدن جس کا اپنے آپ کو

وہ ایک رکن اور زیور سمجھتا ہے ممکن ہے کہ کسی حد تک اس جرم کی ذمہ دار ہو جس کا وہ فیصلہ کرنے بیٹھا ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ وہ جج ایک نہایت منصف مزاج ایماندار اور نیک نفس انسان ہے جو بغیر شہادت کو بخوبی جانچے سزا نہیں دیتا۔ ہم یہ بھی مانے لیتے ہیں کہ وہ شک کا فائدہ ملزم ہی کو دیتا ہے (حالانکہ ہمارے جج عام طور پر اس کمزوری سے بیگانہ ہیں اور ان کے دلوں میں شکوک ذرا مشکل ہی سے پیدا ہوتے ہیں) لیکن پھر بھی قریب قریب ہمیشہ ملزم اور وہ دو مختلف دنیاؤں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں کوئی چیز بھی شاید مشترک نہیں اور جو ایک دوسرے کے سمجھنے سے قطعی طور پر قاصر ہیں۔ ممکن ہے کہ شاذ و نادر کبھی کوئی جج ملزم کے دل و دماغ اور ماحول کا ذہنی طور پر اندازہ لگا سکے لیکن اس کی ذہنیت کا جذباتی شعور اسے کبھی نہیں ہو سکتا اور بغیر اس کے ملزم کے افعال کو صحیح طور پر سمجھنا ناممکن ہے۔

سزائیں دی جاتی ہیں اور ان سزاؤں کی داستان بھی عجیب و غریب ہے۔ جتنا ہی یہ معلوم ہوتا جاتا ہے کہ جرائم میں کمی ہونے کے بجائے اور اضافہ ہو رہا ہے اتنی ہی وحشیانہ اور ہولناک سزائیں اور ہمک ہمک کے دی جاتی ہیں تاکہ جرم کرنے والا اس سزا کے خوف کی وجہ سے ارادۂ جرم سے باز آئے۔ ججوں نے اور اس طاقت نے جو ججوں کے پس پشت ہے ابھی نہ تو اس حقیقت کو سمجھا ہے

کہ جرم کرنے کے خاص اسباب ہوتے ہیں جن کو تفتیش سے معلوم کیا جا سکتا ہے اور جن میں سے کم سے کم کچھ قابو میں لائے جا سکتے ہیں اور نہ یہ جانا ہے کہ تعزیزی قانون کی سختی کسی گروہ کے اخلاقی یا سماجی معیار کو بلند نہیں کر سکتی اور نہ ایک جابرانہ سزا کسی خطاوار فرد کو سدھار سکتی ہے۔ ان کے یہاں تو سیاسی اور غیر سیاسی دونوں قسم کے جرائم کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ ایسی سزا دی جائے کہ مجرم تھرتھرا اُٹھے اور دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔ آج کل کسی ایسی تقریر نظم یا گانے کی سزا جو حکومت کی ناگواریِ خاطر کا باعث ہو عام طور پر دو سال (سرحدی صوبے میں یہ تین سال ہے) رکھی گئی ہے اور ان کو روزانہ نہایت دریا دلی کے ساتھ تقسیم کیا جا رہا ہے۔ لیکن جب ہم اُن کثیر التعداد بدنصیبوں کی مثال پر غور کرتے ہیں جو چار چار پانچ پانچ سال بلکہ اس سے بھی زائد زمانہ سے بغیر کوئی مقدمہ ہوئے یا بغیر کسی جرم میں سزایاب ہوئے جیلخانوں میں بند ہیں تو اس کے مقابلہ میں یہ سخت سزائیں بھی ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔

لیکن سیاسی مجرموں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے اس کی مثالیں ہمیں یہ اندازہ لگانے میں کوئی مدد نہیں دیتیں کہ قانون تعزیزات کا نفاذ عام طور پر کیسے کیا جاتا ہے کیونکہ ان کا دار و مدار بہت کچھ حکومت کی اُس وقت کی مزاجی کیفیت پر اور ان حالات اور واقعات پر ہوتا ہے جو تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور ایک سے نہیں رہتے۔ کبھی کبھی تو یہ ایک دوسرے کی حدیں

آجاتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر بھی ڈالتے ہیں مثلاً بہت سے مقدمات جو آراضی اور مزدوروں کے متعلق ہوتے ہیں وہ اکثر دراصل کسی سیاسی تحریک کا نتیجہ ہوتے ہیں - یہ بھی بخوبی معلوم ہے کہ بہت سے ان لوگوں کے خلاف جن کا آزاد رہنا پولیس کے نزدیک سیاسی اعتبار سے نامناسب ہے آوارہ گردی یا اسی قسم کی کوئی اور ضابطہ فوجداری کی دفعہ قائم کرکے مقدمہ چلا دیا جاتا ہے اور بغیر کوئی خاص جرم ان پر لگائے انھیں بدمعاش قرار دے کر جیل خانوں میں بند کر دیا جاتا ہے - ان سے قطع نظر کرکے اور محض انھیں مثالوں پر (جنھیں جرائم خالص کہا جا سکتا ہے) غور کرنے سے دو باتیں صاف ظاہر ہوتی ہیں - ایک تو یہ کہ تعداد جرائم میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور دوسرے یہ کہ سزا کی سختی اور میعاد بڑھتی جا رہی ہے - ہر سال مختلف صوبوں کے جیلوں کی رپورٹیں قیدیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور ان کو رکھنے کے لئے جگہ کی قلت کی شکایتوں سے پُر ہوتی ہیں - وہ چوٹی کے سال جب سول نافرمانی کرنے والے مجرموں نے ہزاروں کی تعداد میں جا کر جیل خانے بھر دیے تھے اب بغیر ان کے جائے ہوئے بھی قیدیوں کی تعداد کے اعتبار سے معمولی سال بن گئے ہیں - کبھی کبھی اس مشکل کو یوں حل کیا جاتا ہے کہ چند ہزار ایسے قیدی جن کی سزا کی میعاد کم ہے چھوڑ دیے جاتے ہیں لیکن پھر بھی مشکل بدستور باقی رہتی ہے -

ہمارے سنٹرل جیل ان قیدیوں سے جن کو حبس دوام کی یا دسن دسن

بارہ بارہ سال کی سزا دی گئی ہے بھرے ہوئے ہیں ۔ ان میں سے اکثر توڈاکہ زنی یا اسی قسم کے دیگر جرائم میں ماخوذ ہو کر یکبارگی غول کے غول کی صورت میں داخل ہوتے ہیں اور غالباً ان میں سے کافی تعداد نے جرم کیا بھی ہوتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ کچھ بے گناہ بھی ہوتے ہیں کیونکہ ثبوت کی شہادت کا عام طور پر سارا دارومدار شناخت پر ہوتا ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ ڈکیتیوں کی اتنی افراط ہمارے عوام اور کم حیثیت درمیانی طبقہ کی روز افزوں بے روزگاری اور مفلوک الحالی کا نتیجہ ہیں ۔ اکثر دیگر جرائم کا باعث بھی جن کا تعلق مال غصب کر لینے سے ہے یہی ہولناک ناداری اور فاقہ مستی ہے جس کا زیادہ تر لوگوں کو آئے دن سامنا کرنا پڑتا ہے ۔

کیا ہمارے جج کبھی اس حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں یا اُس مکمل مایوسی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جو بیوی بچوں کو فاقہ کرتے ہوئے دیکھ کر ایک معمولی احساسات رکھنے والے انسان کے دل و دماغ پر طاری ہوتی ہے ؟ کیا انسان اپنے سب سے قریبی عزیزوں کو سادہ ترین ضروریات زندگی مہیا نہ کر سکنے کی وجہ سے بیمار پڑتے اور دم توڑتے دیکھ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہ سکتا ہے ؟ اُس سے لغزش ہوتی ہے اور وہ قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے اُس کے بعد قانون اور جج مل کر اس بات کا پورا پورا انتظام کر لیتے ہیں کہ اُس غریب کو ایک معمولی انسان کی حیثیت سے سماج کی معاشرتی زندگی میں

کوئی کارآمد کام کرنے کا پھر کبھی کوئی موقع نہ ملے۔ وہ خود اس ذہنیت کے پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں جس کو مجرمانہ کہا جاتا ہے اور پھر خود ہی حیرت ظاہر کرتے ہیں کہ اس قسم کے افراد ہیں اور بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

سنگین جرائم میں تو حبس دوام یا دس سال کی سزا دی جاتی ہے لیکن معمولی جرائم کے ارتکاب پر جو سزائیں دی جاتی ہیں وہ ان سے بھی زیادہ سبق آموز ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر تو عدالتی کاغذات میں دفن ہیں اور منظرِ عام پر نہیں آتیں (شاذ و نادر اخباروں میں کسی ایسے مقدمہ کی خبر شائع ہوتی ہے) تین ایسی مثالیں جو تازہ روزناموں سے بغیر کسی انتخاب کی نیت کے لی ہیں پیش کرتا ہوں۔

رحمن ایک پرانا خطا وار تھا جو بارہ مرتبہ سزایاب ہو چکا تھا اور پہلے پہل ۱۹۱۲ء میں ماخوذ ہوا تھا۔ اس بار اس نے کچھ کپڑے چرائے تھے جن کی قیمت محض تین چار روپے تھی۔ رحمن نے ارتکاب جرم کا اقبال کیا اور عدالت سے بہ دست بستہ درخواست کی کہ اُسے کسی دارالاصلاح (Reform-atory) یا کسی اور ایسی جگہ بھیجدیا جائے جہاں اس کا چال چلن سُدھر سکے۔ جج نے جو کہ سندھ کے جوڈیشنل کمشنر صاحب تھے اس کی استدعا نامنظور کی اور اُسے سات سال کی سزا دی اور فیصلہ میں یہ ٹکڑا جوڑ دیا کہ اگر یہ سات سال کی سزائے سخت تمہاری اصلاح نہیں کر سکتی تو پھر سوائے

ذاتِ خدا کے اور کوئی تمھاری مدد نہیں کرسکتا (کراچی - ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء)

بدری کو جو کہ چار مرتبہ کا سزا یافتہ تھا حسب دفعات ۴۱۱/۷۵ تعزیرات ہند دو سال کی قیدِ سخت دی گئی - اس کے قبضہ سے ایک سوتی چادر جو کہ مال مسروقہ کہی جاتی تھی برآمد ہوئی تھی (لکھنؤ - ۲ جولائی ۱۹۳۵ء)

غلام محمد ایک عادی مجرم کو ایک شخص کی جیب سے ایک روپیہ نکال لینے پر تین سال کی قیدِ سخت دی گئی (سیالکوٹ - ۱۵ جولائی ۱۹۳۵ء)

یہ اور اسی قسم کی اور سزائیں ممکن ہے کہ تعزیرات ہند کے اعتبار سے بالکل مناسب اور صحیح ہوں لیکن کسی جج کا یہ سمجھنا کہ وہ ایسی سزائیں دے کر مجرم کی اصلاح کر رہا ہے میرے لئے نہایت حیرت انگیز ہے - غالباً سندھ کے جوڈیشل کمشنر صاحب کے دل میں اپنے طرزِ علاج کے کارآمد ثابت ہونے کے بارے میں کافی شکوک تھے کیونکہ انھوں نے خود اشارہ کیا ہے کہ اگلے موقع پر یہ خدمت اللہ میاں کے سپرد کی جائے -

عدالتوں کے کمروں میں روزانہ مقررہ اوقات پر یہ جج شان سے بیٹھتے ہیں اور مصیبت کے مارے ہوئے بدنصیبوں کی ایک مسلسل برات ان کے سامنے سے گزرتی ہے - ان میں سے کچھ پھانسی کے ہولناک تختے تک پہونچ جاتے ہیں - کچھ کوڑوں کی مار کھاتے ہیں اور زیادہ تر مختلف میعادوں کی سزائیں پاتے ہیں جن میں کبھی کبھی قید تنہائی بھی شامل کردی جاتی ہے - انصاف

کرنے اور سزا دینے کے متعلق ان کے کچھ فرسودہ دور از کار اور موہوم خیالات ہیں اور وہ انھیں کے ماتحت اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ وہ اس خیال کو دل سے دور نہیں کر سکتے کہ وہ سماج کے محافظ ہیں اور ان کا فرض ہے کہ وہ موجودہ نظام کو ان مجرمانہ عناصر سے بچائیں جو موجودہ تمدن یا معاشرت کی تخریب کے درپے ہیں۔ ان کے خیالات اس محدود دائرہ کو چھوڑ کر انسانیت کی سطح تک کبھی نہیں آتے اور وہ ملزم کے بارے میں یہ کبھی نہیں سوچتے کہ یہ بدنصیب بھی ایک انسان ہے اور انسانوں کی طرح اس کے بھی ماں باپ بیوی بچے عزیز اور دوست ہیں۔ وہ ایک فرد کو سزا دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک گروہ کو بھی سزا دیتے ہیں کیونکہ مصیبت کی لہریں بڑی دُور دُور تک پھیلتی ہیں۔ جو لوگ کہ جان دیتے ہیں وہ کم سے کم جلدی مر جاتے ہیں اور ان کی جان کنی کی تکلیف مختصر ہوتی ہے۔ لیکن جو لوگ کہ جیلخانوں میں عمریں گزارتے ہیں اُن کا درد ناگفتہ بہ ہے ؎

اونچی دیواروں کے اندر لوہے کی سلاخوں کے پیچھے
بیٹھے ہیں مُقفل کچھ انساں۔ انساں جو نہیں اک گنتی ہیں

چھوٹی سی زندگی میں سے تین سال، سات سال یا اس سے زائد چُرا لینا۔ ہر سال بارہ[۱۲] مہینہ کا۔ ہر مہینہ تیس[۳۰] دن کا۔ ہر دن چوبیس گھنٹوں کا۔ بیچارے قیدی کو یہ میعاد کسی طرح ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔ وقت اوروں کے لئے

چاہے کتنا بھی تیز رفتار ہو لیکن بدقسمت قیدی کے لئے جوں کی چال چلتا ہے۔

کہا جائے گا کہ اس میں شک نہیں کہ یہ نہایت غمناک اور قابلِ افسوس صورتِ حال ہے لیکن بیچارہ جج کیا کرے؟ کیا وہ اپنے احساسات اور جذبات کے ہاتھوں بک جائے اور قانون توڑنے والوں کو سزا دینا بند کر دے؟ اگر وہ اتنا نرم دل اور زود حِس ہے تو وہ اچھا جج کبھی نہیں ہو سکتا اور اُسے کسی دوسرے کے لئے جگہ خالی کرنا پڑے گی۔ نہیں۔ ججوں سے یہ مطالبہ نہیں ہے۔ کوئی شخص ججوں سے یہ اُمید نہیں رکھتا کہ وہ ہر ملزم کو گلے سے لگالیں اور اس کی کھانے پر دعوت کریں لیکن اگر مقدمہ کرنے اور سزا دینے میں ایک انسانیت کا عنصر بھی شامل ہو جائے تو یقیناً معاملات بہت کچھ رُو بہ اصلاح ہو جائیں گے۔ ہمارے جج بہت زیادہ خشک بے حِس اور جذبات سے مبرّا ہوتے ہیں اور وہ اپنی دی ہوئی سزاؤں کے نتائج کو بھی بہت کم سمجھتے ہیں۔ اگر کسی طرح ان کا شعور بڑھایا جا سکے اور ساتھ ہی ساتھ ان کو یہ احساس بھی ہونے لگے کہ مجرم بھی ہمارا ہی ایسا ایک انسان ہے تو یہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ دونوں قریب قریب ایک ہی طبقہ کے ہوں۔ اگر کوئی امیر ساہوکار جس نے تغلب کیا ہے اور پبلک کا ہزاروں روپیہ کھا گیا ہے قانون کے شکنجے میں پھنستا ہے اور اس پر مقدمہ چلایا جاتا ہے تو جج کو اس سے پوری ہمدردی ہوتی ہے لیکن اس بیچارے

بدنصیب پر جس نے کسی فوری ضرورت سے مجبور ہو کر ایک روپیہ چرا لیا یا ایک چادر رکھ لی اُسے کوئی ترس نہیں آتا۔ جج اور ایک معمولی ملزم کا ایک ہی طبقہ کا ہونا ہر بڑی اصلاح کی طرح موجودہ نظام معاشرت میں ایک بڑا زبردست اور بنیادی تغیر پیدا کرنا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی اس امید میں کہ آئندہ ایسا ہوگا کوئی بہتر صورت یقیناً نکالی جا سکتی ہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے یہ برنارڈ شا (Bernard Shaw) ہی نے تجویز کیا تھا کہ ہر جج، مجسٹریٹ اور جیل کے افسر کو کچھ نہ کچھ زمانہ جیلخانہ میں معمولی قیدیوں کی طرح بسر کرنا چاہیئے۔ صرف اسی صورت میں ان کو لوگوں کو سزا دینے یا قید خانوں میں ان پر حکم چلانے کا حق ہو سکتا ہے۔ تجویز تو نہایت معقول ہے لیکن اس کو عملی جامہ پہنانے میں مشکلیں ضرور ہیں۔ میں نے ایک دفعہ دبی زبان سے سابق ہوم ممبر صاحب اور صوبۂ متحدہ کے جیلوں کے انسپکٹر جنرل صاحب سے اس پر عمل کرنے کی درخواست کی تھی لیکن انھیں یہ بات کچھ پسند نہ آئی۔ کم سے کم ایک مشہور و معروف جیل کے افسر نے اس پر عمل ضرور کیا ہے۔ میرا اشارہ ٹامس ماٹ آسبرن (Thomus Mott Osborne) کی طرف ہے جو نیویارک کے سب سے بڑے جیلخانے سنگ سنگ (Sing Sing) کا افسر تھا۔ اس نے خود ایک عرصہ تک معمولی قیدیوں کی طرح زندگی گزار کر اپنے آپ کو تربیت دی

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے قیدیوں کی فلاح و بہبودی کے لئے بہت سی ایسی باتیں رائج کیں جن سے ان کے اخلاق و عادات کی اصلاح میں حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی ان کے دل و دماغ روشن ہو گئے اور وہ اسی سماج کا ایک رکن بن گئے جس کے دامن پر وہ پہلے ایک بدنما داغ سمجھے جاتے تھے۔

اس طرح اپنی مرضی سے ایک مدت تک جیلخانوں میں رہنا ہمارے ججوں، مجسٹریٹوں اور جیل کے افسروں کو جسمانی اور روحانی دونوں اعتبار سے بہت کافی مفید ثابت ہوگا۔ قید خانہ کی زندگی کے متعلق ان کی واقفیت بھی بڑھ جائے گی اور انھیں اس کا بھی کسی قدر صحیح اندازہ ہو جائے گا کہ ایک قیدی پر کیا گزرتی ہے اور وہ اپنے دن کس طرح کاٹتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اپنی مرضی سے جیلخانہ میں رہنا اور اصلی سزا بھگتنا کبھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ وہ سزا کی اصلی خلش کبھی محسوس نہیں کر سکتے اور وہ اس بے بسی اور بے چارگی یا اُس شکستگی اور مجبوری کی کیفیت کا جو ایک غریب قیدی پر حکومت کی مسلح طاقت کے سامنے دیواروں میں گھر کر طاری ہوتی ہے کوئی اندازہ نہیں کر سکتے اپنی مرضی سے جیل میں رہنے والوں کو کبھی اس بات کا بھی کوئی خوف نہیں ہے کہ جیل کا کوئی افسر چھوٹا یا بڑا ان کے ساتھ کسی قسم کی کوئی بدسلوکی کریگا۔ سزا کا وہ نفسیاتی پس منظر بھی (یعنی سماج کا ایک فرد کو ناکارہ سمجھ کر علیحدہ کر دینا یا یوں سمجھئے کہ ایک بیمار عضو قرار دے کر کاٹ ڈالنا) اُن کی نظر کے سامنے نہیں آتا

تاہم ان تمام خامیوں کے باوجود یہ تجربہ بہت قیمتی ہوگا اور تعزیرات کے نظام اور نفاذ کو بہت کچھ مفید شائستہ اور انسانیت کا حامل بنا دیگا۔ سول نافرمانی اور عدم تعاون کی تحریکوں کے دوران میں درمیانی طبقہ کے کثیر التعداد لوگوں نے ہمارے جیلخانوں پر جو دھاوا بول دیا تھا اس کا ایک طور پر کافی اچھا اثر پڑا۔ یہ صحیح ہے کہ جیلخانے جانے والوں میں سے کوئی نہ تو جج ہو اور نہ جیل کا افسر اور براہ راست وہ کوئی اثر نہ ڈال سکا۔ لیکن پھر بھی جیل کے حالات کی واقفیت بہت زیادہ پھیل گئی اور قیدی کے ساتھ ایک عام ہمدردی پیدا ہوگئی اور رائے عامہ اور کچھ کانگریس والوں کا بے غرضانہ جہاد کافی بارآور ثابت ہوا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں ضرورت سے زائد نرم دل ہوں کہ نہیں مگر اپنے نزدیک میں جذبات سے جلد متاثر ہوجانے والا یا رقیق القلب نہیں ہوں میرے قریبی دوست اور بہت سے پرانے ساتھی تو مجھ کو سخت دل سمجھتے ہیں۔ سی۔ آر۔ داس مرحوم نے ایک بار آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ میں میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس شخص کا خون سرد ہے۔ شاید ایسی رایوں کا انحصار محض وقتی مقابلہ پر یا اپنے جذبات کو ظاہر کرنے یا چھپانے کی قابلیت پر ہوتا ہے۔ بہر صورت اس کی وجہ کچھ بھی ہو یہ واقعہ ہے کہ محض کسی شخص کو سزا دینے کا خیال ہی میرے دل میں ایک نفرت پیدا کرتا ہے خصوصاً وہ عبرت آموز سزا جس میں کسی کو ستانے کے لئے جان بوجھ کر ظلم اور سختی برتی جاتی ہے۔ غالباً

موجودہ دنیا میں اس کو یک قلم مسترد تو نہیں کیا جا سکتا پھر بھی یقیناً اس کی جابرانہ سختی کو بہت کچھ کم کیا جا سکتا ہے اور انسانیت کا عنصر ملا کر اسے بہت کچھ شائستہ بنایا جا سکتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ میں سزائے موت کا سخت مخالف تھا اور اصولی طور پر اب بھی اس کے خلاف ہوں۔ لیکن اب میں یہ سمجھنے لگا ہوں کہ موت سے زائد بُری بھی کچھ صورتیں ہو سکتی ہیں اور اگر میری ہی پسند پر چھوڑ دیا جائے تو میں غالباً سزائے موت کو حبسِ دوام پر ترجیح دوں گا۔ لیکن پھانسی کے تختہ پر چڑھنا میں پسند نہ کروں گا اور اس کے مقابلہ میں گولی کھانا۔ سر کٹوانا۔ یا بجلی کی کرسی پر جانا گوارا کر لوں گا۔ سب طریقوں سے زائد میں یہ پسند کروں گا کہ مجھے بھی سقراط کی طرح زہر کا پیالہ دے کر ایسی نیند سُلا دیا جائے جس کے بعد کوئی بیداری نہ ہو۔ میری رائے میں سب سے زائد انسانیت اور شائستگی کا طریقہ یہی ہے۔ لیکن ہندوستان میں ابھی تک پھانسی ہی کا رواج ہے اور پارسال صوبۂ سندھ میں کراچی میں یا کسی اور جگہ منظرِ عام پر باقاعدہ متعدد پھانسیاں دے کر ہمارے حکام نے ہم پر یہ بخوبی ظاہر کر دیا کہ اُن کا دماغ کس ساخت کا ہے۔ غالباً اس کا منشا یہی تھا کہ جو لوگ آئندہ خطا کرنے کی نیت رکھتے ہوں وہ سبق حاصل کریں اور مارے خوف کے اپنے ارادے سے باز آئیں۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ہولناک نظارہ دیکھنے کے لئے ہزاروں آدمیوں کا

ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو دماغ ایسے مظاہراتِ عام کے پسِ پشت کارفرما ہے اس کے خدوخال اس ذہنیت سے ایک خاندانی مشابہت رکھتے ہیں جو ہسپانوی مذہبی بازپرس (Spanish Inquisition) کے آتشیں جشنہائے عقیدت (-Autos da-fe) کی محرک تھی۔[1]

میرے ایک دوست کو جو اب ہائی کورٹ کے جج ہیں جب پہلے پہل ایک مجرم کو سزائے موت دینا پڑی تو اُن کے دل میں ایک زبردست جنگ ہوئی اور اُن کے ضمیر پر ایک عجیب کشمکش کا عالم گزرا۔ ان کی طبیعت کسی طرح ایسا کرنا قبول نہ کرتی تھی۔ بہ ہزار مشکل انھوں نے اپنی فطری نفرت اور ہچکچاہٹ پر قابو پایا

---

[1] سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں جو ظلم اور تشدد مذہب کے نام پر یورپ میں ہوا ہے اس کی نظیر تاریخ کے اوراق میں مشکل سے ملتی ہے۔ اسپین۔ فرانس اور اٹلی میں جہاں رومن کیتھلکس کی بے شمار اکثریت تھی مگر کہیں کہیں پروٹسٹنٹ یا کسی دیگر فرقہ کے عیسائی اپنے عقائد کی اشاعت کرنے لگے تھے۔ مذہبی عدالتیں قائم کی گئی تھیں جہاں جن لوگوں کے عقائد مشکوک سمجھے جاتے تھے وہ پکڑ کر لائے جاتے تھے اور ان سے نہایت سختی سے بازپرس کی جاتی تھی۔ ان کے عقائد تبدیل کرنے کے لئے ان پر ہر امکانی تشدد روا سمجھا جاتا تھا تاکہ ان کی روحوں کو عذابِ دوزخ سے بچا لیا جائے لیکن باوجود اس وحشیانہ ظلم وستم کے جو لوگ اپنے عقائد پر ثابت قدم رہتے تھے ان کو ان عدالتوں سے سزائیں ملتی تھیں۔ عام طور پر حکم یہی ہوتا تھا کہ وہ آگ میں جلا دیے جائیں۔ چنانچہ ان مجرموں کے گروہ کے گروہ سربازار جلائے جاتے تھے۔ ان فیصلوں کو (Autos-da-fe) یا احکامِ شریعت کہتے تھے۔ اور ان کا نفاذ منظرِ عام پر کیا جاتا تھا تاکہ یہ کفر پھیل نہ سکے اور مومنین صحیح عقائد کی یہ حفاظت دیکھ کر خوش ہوں اور جشن منائیں۔

(ایسا نہ کرتے تو چند ہی روز میں اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑتا) اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ بہت جلد بلا پس وپیش پھانسی کا حکم سنانے کے عادی ہو گئے۔ وہ غالباً مستثنیات میں سے تھے کیونکہ مجھے اس امر میں بہت بڑا شک ہے کہ عام ججوں کے دل میں جب ایسی نوبت آتی ہے تو کوئی بھی وسوسہ یا تردّد پیدا ہوتا ہے۔

مگر پھانسی لگوانا تو غالباً پھانسی کی سزا دینے سے بھی زیادہ کٹھن کام ہے۔ لیکن اکثر حساس افراد بھی اس ہولناک نظارے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ مقامی جیل میں ایک نوجوان انگریز سولین کے سپرد یہ خدمت ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بتلایا کہ پہلی پھانسی کے وقت اس کی بری حالت ہوئی اور دن بھر اس کی طبیعت مالش کرتی رہی لیکن بہت جلد وہ اس نظارے کا عادی ہو گیا اور کچھ زمانہ بعد تو وہ پھانسی لگوا کر سیدھا میز پر جا کر صبح کا کھانا ڈٹ کر کھاتا تھا۔

میں نے خوش قسمتی سے آج تک کوئی پھانسی لگتے نہیں دیکھی ہے۔ زیادہ تر جیلخانوں میں جہاں میں رہا ہوں کسی مجرم کو پھانسی نہیں دی گئی لیکن تین چار موقعہ ایسے ضرور آئے۔ یہ پھانسیاں ایک مخصوص محدود احاطہ میں دی جاتی تھیں جو الگ اور دُور ہوتا تھا لیکن پھر بھی تمام قیدیوں کو اس کی اِطلاع ہو جاتی تھی۔ شاید اُس روز بارکوں اور کوٹھریوں کے قفل اور دنوں کے مقابلہ میں زیادہ دیر سے کھُلنے کی وجہ سے اس بات کا پتہ چل جاتا ہو۔ میں نے

ایسے دنوں میں ایک عجیب کیفیت محسوس کی ہے جیسے کہ ایک منحوس خاموشی طاری ہے اور لوگ دبی آواز میں بات چیت کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ سب محض میرے واہمہ کی خیال آرائیاں ہوں۔

لیکن باوجود اُس نفرت کے جو میرے دل میں سزائے موت کے خلاف ہے میں سمجھتا ہوں کہ ان بدسرشت انسانوں کی خباثت کا خاتمہ کرنے کے لئے جن کی زندگی قطعی طور پر سماج کے لئے مضر ہے کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کرنا ہی پڑے گا جس کو بہت احتیاط سے برتا جائے گا۔ سزائے موت یا دیگر سزاؤں کے خلاف جو اصل اعتراض ہے وہ سزا پانے والے کی تکلیف اور مصیبت نہیں ہے بلکہ ایسا کرنے سے اس سماج کی (جو ایسی سزائیں جائز سمجھتی ہے) انسانیت رفتہ رفتہ زائل ہو جاتی ہے اور وہ درندہ صفت بن جاتی ہے اور خصوصاً وہ افراد جن کے سپرد اس کے انجام دینے کی خدمت سپرد ہوتی ہے بالکل نیم وحشی ہو جاتے ہیں یہ بات سزائے تازیانہ کی مثالوں میں جو کہ ہندوستان میں بہت عام اور رائج ہے خاص طور پر نظر آتی ہے۔ سزائے تازیانہ کو جائز قرار دینے کے لئے سرکاری صفائی یہ دی جاتی ہے کہ یہ محض ہولناک جرائم مثلاً زنا بالجبر وغیرہ کے لئے مخصوص ہے مگر عملی طور پر اس کا استعمال بہت زیادہ وسیع ہے اور ۱۹۳۲ء میں (جیسا کہ برطانوی پارلیمنٹ میں بتایا گیا) سول نافرمانی کرنے والے پانچ سو قیدیوں کو کوڑے مارے گئے۔ یہ تعداد تو وہ تھی جس کا اندراج سرکاری کتابوں میں

موجود تھا اور اس میں وہ سیکڑوں مثالیں شامل نہ تھیں جن کو کہیں لکھا نہ گیا تھا۔
سیاسی قیدیوں کو خالص سیاسی جرائم پر یا جیل کے ضابطہ کی قانون شکنی پر یہ کوڑے مارے گئے تھے۔ انھوں نے نہ تو کوئی تشدّد کیا تھا اور نہ ان کی خطا مخربِ اخلاق یا خلاف انسانیت تھی۔ عاملانہ قوانین میں اب یہ قاعدہ بھی شامل کیا گیا ہے کہ جیلخانے میں شدید قسم کی فاقہ کشی کرنے والوں کو بھی کوڑے مارے جا سکتے ہیں۔ گویا ہماری برطانوی حکومت کی رائے میں جیل کے قواعد کی خلاف ورزی کرنیوالا یا فاقہ کشی کرنے والا اور زنا بالجبر کا مجرم یکساں ہیں اور ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔
جیلخانوں میں کوڑے مارنے کا کام عام طور پر کسی نیچ ذات قیدی سے لیا جاتا ہے۔ کوئی قیدی اس کام کو پسند نہیں کرتا لیکن یہ خدمت اس سے پوچھ کر اُسے نہیں دی جاتی۔ اونچی ذات والے قیدی تو اُس صورت میں بھی اس سے انکار کر دیتے ہیں اور اکثر جیل کے ادنیٰ اہلکار اور محافظ بھی اس خدمت سے بچنا چاہتے ہیں۔ ایک واڑڈر (Warden) نے میرے علم میں ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اس عدول حکمی پر اس کو سزا بھی دی گئی تھی۔ قیدیوں اور جیل کے ادنیٰ اہلکاروں کی اس ذی حسی کا اپنے ججوں، جیل کے افسروں اور اس حکومت کی بے حسی سے مقابلہ کرنا (جو سزائے تازیانہ کی حامی ہے اور اسے جائز قرار دیتی ہے) کافی غور طلب اور سبق آموز ہے۔

حال ہی میں میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا جو برطانیہ میں فلموں کی نگرانی

اور نکتہ چینی (Censorship) کے اصولوں کے متعلق تھی۔ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ فلموں سے کچھ سین کاٹ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ان میں ظلم اور تشدّد کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ ایسے فلموں کو دکھانے کی اجازت نہیں دی جاتی "جن میں کسی جانور کے درد یا کرب کو دکھایا جاتا ہے چاہے وہ چوٹ اُسے اتفاقیہ پہونچی ہو یا ارادۃً پہونچائی گئی ہو" کیونکہ اس کا دیکھنے والوں پر خصوصاً بچّوں پر بُرا اثر پڑتا ہے اور ان کے اخلاق خراب ہوتے ہیں۔

ہمارے ہندوستان میں بھی فلموں کی نکتہ چینی اور نگرانی ہوتی ہے اور جانوروں کو ظلم اور بدسلوکی سے بچانے کے لئے ایک انجمن بھی قائم ہے۔ لیکن بدنصیب دوٹانگ والے جانور کو یہاں جانوروں میں بھی شمار نہیں کیا جاتا اور وہ اس انجمن کی سرگرمیوں سے بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں کرسکتا۔ اور ہماری فلموں کی سنسرشپ فقط اس لئے ہے کہ وہ "کوئٹہ کا زلزلہ" "نیشنل کانگریس کے سین" "مہاتما گاندھی کی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے روانگی" یا اسی قسم کے دیگر خطرناک فلموں کو ممنوع قرار دے۔

پھانسی یا تازیانہ کی سزائیں ہمارے دلوں کو متاثر کرتی ہیں اور ہم ان کی سختی محسوس کرتے ہیں لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ اُن ہزاروں بلکہ لاکھوں سزاؤں کا جو ہماری عدالتیں دیتی ہیں محض ایک بہت چھوٹا سا جزو ہیں۔ سزا پانے والوں کی کثیر تعداد تو لمبی لمبی میعادوں کے لئے جیلخانوں میں بند رہتی ہے۔ ان کی

زندگی ایک مسلسل کرب اور ایک لامتناہی درد بن جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے جسم سُن پڑ جاتے ہیں اور ان کے دل و دماغ بے حس ہو جاتے ہیں۔

ہمارا آئینِ فوجداری اور ہمارے جیلخانوں کے قواعد وضوابط مل کر قیدی کی مجرمانہ فطرت کو پختہ کر دیتے ہیں اور پھر اس کے بعد ہمارے نظام معاشرت میں اس کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔ جنس ناکارہ کی طرح اس کی کہیں مانگ نہیں ہوتی دنیا سے اس کے کوئی تعلقات باقی نہیں رہتے۔ نہ اس کا کوئی گھر ہوتا ہے نہ زمین۔ ہر ایک کو وہ مشکوک سمجھتا ہے اور خود سب کی نگاہوں میں مشتبہ ہوتا ہے یہاں تک کہ آخرکار وہ گھوم پھر کر جیلخانہ میں اپنی جائے قیام پر پلٹ کر واپس آجاتا ہے جہاں وہ ٹین یا لوہے کا تسلا جو تنہا اس کا وفادار رفیق تنہائی تھا اسے پھر مل جاتا ہے۔ کیا ہمارے جج کبھی یہ سوچنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں کہ ان کی اک ذرا سی جنبشِ قلم کے کیا لازمی نتائج رونما ہوتے ہیں؟ کیا وہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ ان کی عدالتیں ہی وہ کارخانے ہیں جہاں وہ مجرمانہ ذہنیت تیار ہوتی ہے جس پر جیلخانوں میں پختگی کی مُہر لگائی جاتی ہے؟

جیلخانوں میں حکومت کرنے والے گروہ کے ظلم و تشدد اور جبر کا وہ بھیانک آہنی پنجہ جس کے قبضہ میں دراصل عنانِ سلطنت ہوتی ہے بالکل صاف نظر آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جارج واشنگٹن کا مقولہ تھا "حکومت کی

بنیاد نہ تو عقل پر ہے نہ فصاحت پر بلکہ جبر پر جو آگ کی طرح ایک خطرناک نوکر ہے اور ایک مہیب آقا۔" یہ صحیح ہے کہ ہمارا ایوان تہذیب ایک دوسرے سے تعاون، ایک دوسرے کا لحاظ اور ہزاروں طریقوں سے آپس میں اشتراک عمل کر کے تعمیر ہوا ہے۔ لیکن جب کبھی کوئی نازک وقت آتا ہے اور حکومت کوئی خطرہ محسوس کرتی ہے اس وقت یہ عمارت منہدم ہو جاتی ہے یا یوں کہئے کہ حکومت کے پہلے اور بنیادی فرض کے تابع ہو جاتی ہے جو ہر امکانی جبر اور تشدد سے اپنی حفاظت کرنا ہے۔ ایسے زمانے میں فوج، پولیس، جیلخانہ۔ تینوں کی اہمیت کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے اور حکومت کی اصلیت کا چھوٹا سا خاکہ شاید سب میں زیادہ ہولناک عریانی کے ساتھ جیلخانوں ہی میں نظر آتا ہے۔

کیا حکومت کا دار و مدار ہمیشہ جبر اور تشدد ہی پر رہیگا یا کبھی وہ دن بھی آئے گا جب یہ عنصر کم ہوتے ہوتے قریب قریب غائب ہو جائے گا؟ ایسا دن اگر وہ آنے والا بھی ہے تو ابھی بہت دور ہے۔ بالفعل تو حکومت کا نظام تشدد پر قائم ہے اور یہ تشدد اُن گروہوں میں جو اس کو نکالنا چاہتے ہیں ایک جوابی تشدد پیدا کرتا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں اور ان کا ایک ایسا ناقص دائرہ بن گیا ہے جس سے نکلنا دشوار ہے۔ اخلاقی اعتبار سے یہ دونوں قریب قریب یکساں ہیں اور

ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی گنجائش بہت کم ہے۔ مجھے یہ بات ہمیشہ عجیب معلوم ہوتی ہے کہ وہی حکومت جو خود انتہائی جبر پر مبنی ہے ان گروہوں پر جو اس کے خلاف تشدد کرتے ہیں انسانیت اور اخلاق کے خون کرنے کا اعتراض کرتی ہے۔ اپنے تحفظ کی بنا پر اس کو یقیناً اعتراض کرنے کا حق حاصل ہے لیکن اس میں خواہ مخواہ انسانیت اور اخلاق کو کیوں گھسیٹا جاتا ہے؟ حکومت کا تشدّد کچھ صورتوں میں افراد یا چھوٹے چھوٹے گروہوں کے تشدد سے قابلِ ترجیح ضرور ہے کیونکہ وہ کسی حد تک کسی نہ کسی اصول کے ماتحت ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے افراد کا تشدّد بالکل بے ترتیب ہوتا ہے اور تشدد میں بھی ایک نظام کا قائم رکھنا بدنظمی سے بہتر ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس طرح حکومت کی جبر کرنے کی قابلیت اور طاقت بہت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن جس وقت حکومت اپنے ہوش وحواس کھو کر اور جامہ سے باہر ہو کر اندھے پن کے ساتھ تشدد پر اُتر آتی ہے تب یہ ایسی بھیانک چیز ہو جاتی ہے کہ کسی فرد یا گروہ کا تشدد اس کی ہولناکی یا وحشیانہ پن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

نیٹشے (Nietzsche) کا قول ہے کہ "جب تک زندگی ایک ہیجان اور اضطراب کا کرب نہیں سہتی وہ ایک ہنستا ہوا ستارہ پیدا نہیں کر سکتی"۔ کیا ایسا ہونا لازمی ہے اور اس قانونِ فطرت میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں؟ انسانیت کے شیدا کو قدم قدم پر اس مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس کی طبیعت میں جبر، تشدد اور ظلم کے خلاف ایک کراہیت پیدا ہوتی ہے لیکن وہ بجز چپ چاپ کھڑے کھڑے دیکھنے کے اور کچھ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ان پر قابو پانا اس کی طاقت سے بعید ہے۔ ارنسٹ ٹالر (Ernst Toller) کی تمثیلوں میں یہی اک خیال صدائے بازگشت بن کر گونجتا ہے۔ ؎

انساں کی جہالت کا ابھی ہے وہی معیار — ہے سب سے سوا پختہ دلیل آج بھی تلوار

یا ؎

دکھا سکے گی نہ ہرگز جہاں کو امن کی راہ — ستمگری کی وہ مشعل جو دود سے ہے سیاہ

تاہم دنیا میں ابھی ہر طرف جبر و تشدد ہی کا دور دورہ ہے۔ صرف ہمارے ہی ملک میں تشدد کا طریقہ چھوڑ کر اس کا مقابلہ کرنے کی ایک بلند ہمت اور قابلِ قدر کوشش کی گئی ہے۔ اس کا نتیجہ ابھی تاریکی فردا میں روپوش ہے لیکن اس کوشش کی وہ والہانہ کیفیت اور ہمارے رہنما کی وہ بے نظیر پاک نفسی اور غیر فانی اولوالعزمی جس نے ہمیں ہماری ذاتی پستی سے اٹھا کر ایک بلندی پر پہونچا دیا ہم میں موجود ہے اور کبھی مٹ نہیں سکتی۔ لیکن یہ تو وہ اہم سوالات ہیں جو ہمارے ججوں کے سلجھائے انہیں سلجھ سکتے۔ ہم شاید ان کا مکمل جواب اپنی زندگی میں بھی حاصل نہ کرسکیں یا اگر کر بھی لیں تو ایک ضدی دنیا کو اس پر عمل کرنے کے لئے راضی نہ کرسکیں۔ تب تک یہ چھوٹے سوالات اور آئے دن کی

دشواریاں اور پریشانیاں نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ ہم پلٹ کر پھر انھیں ججوں اور جیل کے افسروں کی طرف آتے ہیں اور کم سے کم اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جان بوجھ کر کسی کو جسمانی اذیت یا دلی کرب پہونچانے سے اس کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ ممکن ہے کہ یہ طریقہ مظلوم کی ہمت توڑدے لیکن یہ اُسے سُدھار نہیں سکتا اور اس میں بہت زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ ایذا پہونچانے والا وحشی اور مکروہ بن جائے۔ کیونکہ ظلم کی ہوا میں یہ عجیب خصوصیت ہے کہ نہ تو ظالم کو راس آتی ہے اور نہ مظلوم کو بلکہ دونوں کی انسانیت سلب کرلیتی ہے اور انھیں قعرِ بربادی کی تاریک پستیوں میں ڈھکیل دیتی ہے۔

حقیقت اور حکایت

میری یہ تجویز کہ ہندوستان کے سیاسی اور فرقہ وارانہ مسائل ایک کانسٹی چوئنٹ اسمبلی (Constituent Assembly) طے کرے ملک میں کافی طور پر پسند کی گئی ہے۔ گاندھی جی نے اسے شرفِ قبول بخشا ہے اور اسی طرح اور لوگوں نے بھی۔ پھر بھی کچھ حضرات نے میرا مفہوم غلط سمجھا ہے یا یوں کہئے کہ میرا مطلب سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی ہے۔

سیاسی اور قومی خیال سے اگر ایک بار یہ تسلیم کر لیا جائے (جیسا کہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا) کہ صرف ہندوستان کے باشندوں ہی کو اپنی قسمت کے فیصلہ کرنے کا پورا حق حاصل ہے اور ان کو اپنا نظامِ سلطنت مرتب کرنے کا پورا اختیار ہے تو اس نتیجہ پر پہونچنا لازمی ہے کہ یہ محض ایک منتخب شدہ مجلس آئین ساز ہی کر سکتی ہے جس کے نمائندوں کا انتخاب زائد سے زائد افراد کی رائے سے کیا جائے۔ جو لوگ کہ مکمل آزادی کے خواہاں ہیں اُن کے لئے اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نہیں۔ وہ لوگ بھی جو کہ محض ایک موہوم

ڈومنین اسٹیٹس (Dominion Status) کے طلبگار ہیں ان کو بھی یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ یہ فیصلہ ہندوستان کے جمہور ہی کو کرنا ہے - اب سوال یہ ہے کہ اس فیصلہ پر پہونچنے کی کیا صورت اختیار کی جائے؟ محض افراد یا نام نہاد کے لیڈروں کا کوئی گروہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتا - اور نہ آل پارٹیز کانفرنس (All Parrtius Conference) کے قسم کی خود ساختہ مجلسیں جن کے افراد زیادہ سے زیادہ کچھ اہل غرض کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور جن کا جمہور سے کوئی تعلق نہیں - انڈین نیشنل کانگریس باوجود اتنی طاقتور اور ایک کثیر التعداد جماعت کی نمائندہ ہونے پر بھی یہ فیصلہ تنہا نہیں کر سکتی - یہ ضرور ہے کہ اگر جمہور نے کانگریس کا ساتھ دیا تو کانگریس اس مجلس آئین ساز پر بہت کچھ قابو پالے گی لیکن پھر بھی آخری فیصلہ جمہور ہی کے ہاتھ رہے گا جس کے نمائندوں کے انتخاب سے یہ کانسٹی چوئنٹ اسمبلی بنے گی -

ظاہر ہے کہ اس مجلس شوریٰ کی ان بے روح نقلی کونسلوں اور اسمبلیوں سے جن کو کہ ایک بیرونی طاقت نے جبریہ ہمارے اوپر مسلط کیا ہے کوئی مشابہت نہ ہوگی - یہ اپنے اختیارات بغیر کسی بیرونی مداخلت کے خود جمہور سے حاصل کرے گی میں نے یہ رائے پیش کی ہے کہ اس مجلس کے نمائندوں کے انتخاب میں ہر جوان العمر یا قریب قریب جوان العمر کو رائے

دینے کا حق ہونا چاہیے - انتخاب کے طریقہ کے متعلق غور کرکے بعد کو بھی تصفیہ کیا جا سکتا ہے - ذاتی طور پر میں اس بات کا حامی ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو یہ انتخاب صیغۂ کار کی بنا پر ہونا چاہیے کیونکہ اصل حقوق کی نمائندگی اس طریقہ سے کہیں زیادہ بہتر ہوگی - مقام یا حدود کی بنیاد پر انتخاب کرنے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض اغراض کے نمائندوں کی تعداد زائد ہو جاتی ہے اور بعض حقوق کی پاسداری کرنے والوں کی کمی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے مختلف اغراض کی اہمیت کا اندازہ کرنے میں دھوکا ہو جاتا ہے - لیکن میں ان میں سے کسی ایک طریقہ پر یا ان دونوں کے مشترکہ استعمال پر راضی ہوں - اس مجلس کا کام محض ایک آئین بنانا ہوگا اور پھر اس نئے آئین کی بنا پر نئے انتخابات ہوں گے - مجھے تو ایسی مجلس آئین ساز کے انتخاب اور برسرکار ہونے میں صرف ایک بہت بڑی دشواری سدِ راہ معلوم ہوتی ہے - اور یہ دشواری ایک بیرونی طاقت یعنی حکومت برطانیہ کی موجودگی اور دباؤ ہے - ظاہر ہے کہ جب تک کہ یہ دباؤ قائم ہے کوئی مجلس آئین ساز صحیح معنوں میں اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتی - لہذا سب سے پہلے یہ بات ضروری ہے کہ قوم میں اتنی سکت آ جائے کہ ہندوستان کے جمہور کی مرضی کو منوا سکے دو متضاد مرضیاں ایک ہی وقت میں کامیاب نہیں ہو سکتیں - ان میں ایک دوسرے پر غالب آنے کے لئے ایک جدوجہد ہونا لازمی ہے اور یہی حال

آج ہندوستان کا ہے۔ دراصل یہ تمام جد وجہد برطانوی حقوق اور اغراض کی حفاظت کے لئے اور وہائٹ پیپر (قرطاس ابیض) (White Paper) والی تجویز اس بات کی کوشش ہے کہ ان کو ایک دوامی زندگی مل جائے۔ کوئی مجلس آئین ساز ایسی زنجیروں میں جکڑی نہیں جا سکتی اور جب تک کہ ملک ان زنجیروں کو توڑنے کی طاقت پیدا نہ کرے یہ برسرِ کار نہیں ہو سکتی۔

یہ مجلس فرقہ وارانہ مسائل بھی طے کرے گی اور تاکہ کسی اقلیت کے دل میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہ جائے۔ میں نے یہ رائے پیش کی ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے نمائندوں کو جداگانہ انتخاب سے چنے۔ یہ جداگانہ انتخاب محض مجلس آئین ساز ہی کے لئے ہوگا۔ اس کے بعد آئندہ کا طریقہ انتخاب یا اس کے متعلق اور دیگر معاملات یہی مجلس طے کرے گی۔

میں نے اس کے علاوہ یہ بھی کہا ہے کہ اگر اس مجلس کے مسلمان نمائندے کچھ فرقہ وارانہ مطالبات پر جمے رہیں گے تو میں اس بات پر زور دونگا کہ وہ مان لئے جائیں۔ حالانکہ میں فرقہ وارانہ ذہنیت کو بہت ناپسند کرتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ اغراض کا رُخ بدلنے یا دلوں سے خوف دور کرنے ہی سے جا سکتی ہے اور محض دبانے سے مٹ نہیں سکتی۔ لہٰذا ہم کو مسلم عوام کے دل ودماغ سے یہ ڈر نکالنا ہے اور انھیں اس بات کا احساس دلانا ہے کہ اگر دراصل وہ کوئی حفاظت چاہتے ہیں تو وہ اُن کو ضرور دی جائیگی

میرا ایسا خیال ہے کہ فرقہ وارانہ ذہنیت کو مٹانے کے لئے یہ احساس بہت کافی بااثر ثابت ہوگا۔

لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ اس مرض کا اصل علاج یہ ہے کہ عوام کی توجہ ان فرضی روایات سے جو فرقہ وارانہ مسائل کے گرد جمع ہو گئی ہیں ہٹائی جائے اور ان کو موجودہ زندگی کی حقیقتوں سے آگاہ کیا جائے۔ آج کل فرقہ وارانہ ذہنیت کی پشت و پناہ سیاسی رجعت پسندی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عام طور پر جو لوگ ایسے گروہوں کے لیڈر ہیں وہ سیاسی اور اقتصادی معاملات میں رجعت پسند ہیں۔ اوپری طبقہ کے چند افراد اپنے طبقہ کی مخصوص اغراض کو اس پردے میں چھپاتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جیسے وہ کسی اکثریت یا اقلیت کے مذہبی مطالبات ہیں۔ اگر ہندوؤں۔ مسلمانوں یا کسی دوسرے فرقہ کے مذہبی مطالبات پر ایک گہری نظر ڈالی جائے تو یہ بات صاف ظاہر ہو جائے گی کہ ان مطالبات کا عوام سے کوئی تعلق نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ چند بے روزگار پڑھے لکھوں کی نوکریوں کا سوال ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ درمیانی طبقہ کی بے روزگاری کا سوال اگر تمام سرکاری نوکریاں ازسرِنو تقسیم بھی کی جائیں تو بھی حل نہیں ہو سکتا۔ بے روزگاروں کی تعداد' نوکریوں کی تعداد (سرکاری اور غیر سرکاری دونوں) سے بہت زائد ہے اور یہ بہت تیزی سے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے

ان کا یا ان کی ضروریات کا کسی فرقہ وارانہ مطالبہ میں ذکر بھی نہیں ہے۔ غالباً فرقہ پرست ان کو قابل توجہ بھی نہیں سمجھتے۔ کیا کوئی مجھے بتائے گا کہ کسی مذہبی مطالبہ میں کسانوں کی تکالیف اور پریشانیاں دور کرنے کے بارے میں۔ ان کے لگان یا مالگذاری کے متعلق یا قرضہ کے اس بھاری اور بھیانک بوجھ کے بارے میں جو اُنھیں پیسے ڈال رہا ہے کوئی بھی سوال ہے ؟ کیا ان میں ریل کے یا یا دیگر کارخانوں کے مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کا جن کی تنخواہیں برابر کاٹی جارہی ہیں اور جن کو زندگی کی ادنیٰ ضروریات پورا کرنا بھی مشکل ہوگیا ہے کوئی بھی ذکر ہے ؟ کیا اس یاس اور نا اُمیدی پر بھی ان کی نظر ہے جس کی وجہ سے ادنیٰ طبقہ کے لوگ پاگل ہوئے جارہے ہیں۔ دلائل کی ساری گرماگرمی ان بحثوں پر جن کے ساتھ صرف چند افراد کی اغراض وابستہ ہیں صرف ہوتی ہے کہ کونسل میں کس فرقہ کو کتنی کرسیاں ملیں۔ مشترکہ انتخاب ہو یا جداگانہ۔ صوبجات کے حدود کیا قائم کئے جائیں اور کون صوبہ علٰحدہ کر دیا جائے۔ کیا ایک بھوکے کسان کو جس کا فاقوں سے بُرا حال ہے ان معاملات میں دلچسپی ہوسکتی ہے ؟ لیکن ہمارے فرقہ پرست دوست اس بات کا کافی خیال رکھتے ہیں کہ وہ ان حقیقتوں سے دوچار نہ ہوجائیں تاکہ ان کا حل ان کی اغراض پر اثر نہ ڈالے اور اس وجہ سے وہ عوام کو جھوٹے نزاعات میں اُلجھائے رکھتے ہیں جو کہ عوام کے مفاد کے خیال سے نہایت

حقیر اور دور از کار ہیں۔

فرقہ پرستی کی نفسیات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہو جائیگا کہ یہ دراصل ایک تیسرے فریق سے (یعنی حکومت سے) الطاف و عنایات کی بھیک مانگنا ہے۔ ایک فرقہ پرست کا سلسلۂ خیال ایک بیرونی حکومت کے قیام کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کی انتہائی کوشش اور کامیابی یہی ہے کہ وہ اپنے مخصوص گروہ کے لئے بہترین انعامات حاصل کرے۔ بیرونی حکومت کی موجودگی کو اگر ذہن سے نکال دیا جائے تو اُس کا سلسلۂ خیال ٹوٹ جاتا ہے اور اس کے تمام دلائل اور مطالبات کی بلند پروازی ختم ہو جاتی ہے۔ بیرونی طاقت اور فرقہ پرست جو کہ محض اوپری طبقہ کے چند گروہوں کے نمائندے ہیں حکومت کے سیاسی اور اقتصادی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں چاہتے۔ دونوں کی مشترکہ غرض ہے کہ ان کے حاصل شدہ حقوق برقرار رہیں بلکہ ان میں اور اضافہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں ان اصلی اقتصادی مسائل کو جو آج ملک کے سامنے پیش ہیں حل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے کیونکہ ان کا حل موجودہ تمدن اور معاشرت کو تبدیل کر دے گا اور اُن کے بہت سے حقوق زائل ہو جائیں گے۔ لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ اصل نزاعات کی طرف سے اس طرح نظریں ہٹا لینا اور شتر مرغ کی طرح زمین میں سر چھپا لینا دونوں کے لئے ایک نہ ایک دن مضر

ثابت ہوگا - واقعات اور اقتصادی قوتیں حکومتوں اور سلطنتوں سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتی ہیں اور ان سے بیگانگی برتنا خطرہ سے خالی نہیں -

اس طرح فرقہ پرستی سیاسی اور معاشرتی رجعت پسندی کا ایک دوسرا نام ہوجاتا ہے اور چونکہ ہندوستان میں حکومت برطانیہ رجعت پسندی کی سب میں بڑی جائے پناہ ہے لہذا یہ قدرتی بات ہے کہ وہ ایسے کارآمد اور وفادار معاون کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتی ہے - ہم کو گمراہ کرنے کے لئے بہت سی اُلٹی سیدھی باتیں سمجھائی جاتی ہیں - ہم کو ہندو معاشرت اور اسلامی تہذیب کا فرق دکھایا جاتا ہے - ہماری نظر کے سامنے مذہب، پُرانے رسم و رواج دیرینہ تاریخی روایات اور اسی قسم کے دیگر اختلافات پیش کئے جاتے ہیں - لیکن ان سب کے پردے میں وہی سیاسی اور اخلاقی رجعت پسندی کارفرما ہے لہذا فرقہ پرستی کو مٹانے کی ہر امکانی کوشش کرنا چاہئے کیونکہ یہ کسی رعایت کی مستحق نہیں ہے - چونکہ فرقہ پرستی کے خدوخال ابھی اچھی طرح سے پہچانے نہیں گئے ہیں اس لئے ایسا ہوتا ہے کہ یہ جھوٹا رنگ روپ بنا کر سامنے آتی ہے اور اکثر ناواقف لوگ اس کے فریب میں آجاتے ہیں - اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بہت سے کانگریسی بھی غیر شعوری طور پر ایک حد تک اس کا شکار بن گئے ہیں اور اپنی وطن پرستی کو اس تنگ اور رجعت پسند عقیدہ کے دوش بدوش رکھنے کے

کوشاں رہتے ہیں ۔ اگر دونوں کی اصلی سرشت کا صحیح اندازہ لگایا جائے تو یہ بہت جلدی واضح ہو جائے گا کہ ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اور ان میں کوئی بات مشترک نہیں ہو سکتی ۔ یہ دو مختلف الجنس چیزیں ہیں ۔ وقت آگیا ہے کہ وہ کانگریس والے جو وقتاً فوقتاً ہندو ۔ مسلم ۔ سکھ یا کسی اور فرقہ پرستی سے آنکھیں لڑاتے رہتے ہیں اس بات کو سمجھ لیں اور کسی ایک کو پسند کر لیں ۔ دونوں سے نباہ ناممکن ہے کیونکہ سیاسی اور معاشرتی معاملات میں یا تو انسان ترقی پسند ہو سکتا ہے یا رجعت پسند ۔ کسی قسم کی فرقہ پرستی کے شریک عمل ہونے کے معنی یہی ہیں کہ آپ حکومت برطانیہ یعنی رجعت پسندی کے بازو کو اور مضبوط کرنا چاہتے ہیں ۔ آپ اقتصادی اور معاشرتی تبدیلیوں کے خلاف ہیں ۔ آپ عوام کی سخت اور ناگفتہ بہ تکالیف اور مصیبتوں کا کوئی اثر لینے کو تیار نہیں اور آپ دنیا کے واقعات سے اور رفتارِ زمانہ کی طاقتوں سے جان بوجھ کر چشم پوشی کرنا چاہتے ہیں ۔

فرقہ وارانہ جماعتیں کیا ہیں ؟ باوجود اس کے کہ ان کے ارکان سب ایک مذہب کے ہوتے ہیں اور یہ مذہب کے نام کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہیں یہ مذہبی انجمنیں نہیں کہی جا سکتیں ۔ نہ یہ کسی مخصوص تہذیب و تربیت کی حامی ہیں کیونکہ بجز پرانی تہذیب کی دلچسپ داستانیں سنانے کے انھوں نے تہذیب و تربیت کی ترقی یا تحفظ میں کوئی حصہ نہیں لیا ہے ۔ ان کو اخلاق و اطوار

سُدھارنے کے ادارے کہنا بھی غلط ہوگا کیونکہ ان کی تعلیم علم الاخلاق سے قطعی طور پر عاری ہے۔ یقیناً یہ اقتصادی مجلسیں نہیں ہیں کیونکہ ان کے افراد کسی اقتصادی کڑی سے ہم رشتہ نہیں ہیں اور نہ ان کا اقتصادی پروگرام ہے۔ ان میں سے کچھ یہ بھی دعویٰ کرتی ہیں کہ یہ سیاسی جماعتیں نہیں ہیں۔ آخر پھر یہ کون بُلا ہیں؟

دراصل واقعہ یہ ہے کہ یہ سیاسی طور پر عمل کرتی ہیں اور ان کے مطالبات بھی سیاسی ہیں لیکن اپنے آپ کو غیر سیاسی کہہ کر یہ خود حقیقتوں سے گریز کرتی ہیں اور محض دوسروں کے راستہ میں روڑے اٹکایا کرتی ہیں۔ اگر یہ سیاسی انجمنیں ہیں تو ہم کو ان سے یہ سوال کرنے کا حق حاصل ہے کہ ان کا نصب العین کیا ہے۔ کیا وہ ہندوستان کی مکمل آزادی کی حامی ہیں یا محض جزوی آزادی کی (اگر ایسی کوئی چیز ہے)؟ کیا وہ خود مختاری چاہتی ہیں یا ڈومنین اسٹیٹس؟ (Dominion Status) بہترین الفاظ بھی بعض وقت دھوکا دیتے ہیں اور اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مکمل آزادی اور ڈومنین اسٹیٹس میں فقط نام کا فرق ہے۔ دراصل یہ دو بالکل الگ الگ چیزیں ہیں جس طرح کہ دو راہیں دو مختلف رُخوں پر جائیں۔ یہ روپے میں چودہ آنے بھر کا سوال نہیں ہے بلکہ دو مختلف قسم کے سکّے ہیں جن کا ایک دوسرے سے تبادلہ ناممکن ہے۔

ڈومنین اسٹیٹس چاہنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم برطانوی دولت اور اغراض کے آہنی شکنجہ میں جکڑے رہنا چاہتے ہیں کیونکہ ڈومنین اسٹیٹس میں اس گلا گھوٹنے والی گرفت سے کوئی چھٹکارا ممکن نہیں۔ مکمل آزادی میں ان مصیبتوں سے رہا ہونے کی گنجائش ہے اور اس بات کا اختیار ہے کہ ہم اپنا معاشرتی نظام خود بنائیں۔ لہذا جو کچھ بھی محدود اختیارات ہم کو ڈومنین اسٹیٹس میں حاصل ہوں گے وہ بینک آف انگلینڈ اور برطانوی سرمایہ کے مقدم حقوق سے پابند رہیں گے اور ہمارے لئے موجودہ اقتصادی نظام قائم رکھنا بھی لازمی ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اپنی اقتصادی مشکلات کو حل نہ کرسکیں گے اور عوام کی گردن سے وہ بوجھ جو اُنھیں پیسے ڈال رہا ہے دور نہ کرسکیں گے بلکہ ہم دلدل میں اور گہرے دھنستے چلے جائیں گے۔ تو پھر فرقہ وارانہ انجمنیں کیا چاہتی ہیں؟ مکمل آزادی یا ڈومنین اسٹیٹس؟۔

وہائٹ پیپر (قرطاس ابیض) والے آئین (جو کہ ایک آئین کی مضحکہ انگیز نقل ہے) کی طرف ہمیں متوجہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو محض اس بات کی تلخ یاددہانی ہے کہ جب تک حکومت برطانیہ میں سکت ہے وہ برطانوی سرمایہ اور اغراض کا تحفظ چاہے کوئی بھی جائز حقوق پامال کرنا پڑیں اپنے امکان بھر ضرور کرے گی۔ صرف وہی لوگ جن کا برطانوی اغراض کے تحفظ میں فائدہ ہے یا جو بالکل انیلے اور سیدھے ہیں اس

آئین پر نظر ڈالنے کو بھی تیار ہوں گے -

لیکن اقتصادی نصب العین سیاسی مقصد سے بھی زیادہ اہم ہے - یہ بات تو شہرۂ آفاق ہے کہ اب سیاست کا وہ مرتبہ نہیں اور جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں اقتصادی طاقتیں قومی نیز بین الاقوامی معاملات پر بخوبی حاوی ہیں - فرقہ وارانہ جماعتیں اقتصادی معاملات میں کیا رائے رکھتی ہیں ؟ کیا وہ اطمینان کے ساتھ اس فاقہ مستی اور بے روزگاری سے بیخبر ہیں جس نے ہمارے غریب عوام اور کم حیثیت لوگوں کی زندگی کو تیرہ و تار بنا دیا ہے ؟ اگر وہ عوام کے نمائندہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کروڑوں بیچارے اور بدقسمت غریبوں کے لئے سب سے پہلا اور اہم سوال ان کی فاقہ مستی کا ہے اور ان کے ذہن و دماغ میں کوئی حل (کم سے کم خیالی ہی سہی) اس آفت اور مصیبت کو دور کرنے کے لئے ہونا چاہئے - کیا زراعتی اور صنعتی معاملات میں انکی کوئی تجویز نہیں ؟ وہ مزدور اور کسان کی مشکلیں کس طرح حل کرتے ہیں اور زرعی قانون میں وہ کیا تبدیلیاں مناسب سمجھتے ہیں ؟ کسانوں کے قرضہ کے بارے میں انھوں نے کیا سونچا ہے ؟ کیا یہ قلمزد کر دیا جائے ، یا محض کم کر دیا جائے ، یا بدستور قائم رکھا جائے ؟ - بے روزگاری کا کیا حل ہے ؟ کیا وہ موجودہ نظام سرمایہ داری کے حامی ہیں یا انکے ذہن میں کوئی

نیا نظام ہے؟ یہ محض چند سوال ہیں لیکن ان کے جوابات سے فرقہ پرستوں کے دعووں اور مطالبات کی پوشیدہ حقیقت فوراً آئینہ ہو جائے گی۔ اور اگر یہ جوابات کسی طرح عوام تک پہونچیں تو سب سے زیادہ ان کی آنکھیں کھلیں گی۔ مسلم عوام غالباً ہندو عوام کے مقابلہ میں زیادہ ہی تباہ حال ہیں لیکن "چودہ شرائط" میں ان غربت زدہ مسلمانوں کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ ہندو فرقہ پرست بھی اپنی اغراض کے تحفظ پر سارا زور دیتے ہیں اور اپنے عوام کی ضروریات کا کوئی خیال نہیں کرتے۔

مجھے ڈر ہے کہ غالباً میرے کسی سوال کا مجھے کوئی جواب نہ ملے گا کیونکہ اول تو یہ سوال ذرا ٹیڑھے ہیں اور دوسرے فرقہ پرستوں کے لیڈر اقتصادی معاملات ذرا کم سمجھتے ہیں اور انھوں نے عوام کی بہبودی پیش نظر رکھ کر کبھی سوچنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ وہ فقط اس بات میں ماہر ہیں کہ فیصدی ان کا حق کتنا نکلتا ہے۔ ان کا میدانِ کارزار کھیت کا رخانہ بازار نہیں ہے بلکہ چھوٹا سا کانفرنس کا کمرہ لیکن چاہے وہ اسے پسند کریں یا نہ کریں یہ سوالات ایک نہ ایک دن سامنے آئیں گے اور جو لوگ ان کا تشفی بخش جواب نہ دے سکیں گے ان کو عوام الناس اپنے معاملات میں زیادہ دخل نہ دینے دیں گے۔ ہم لوگوں میں سے اکثر ان سب سوالات کا صرف ایک جامع لفظ میں جواب دے سکتے ہیں اور وہ لفظ "سوشلزم" (اشتراکیت) ہے۔ یعنی

تمدن کی بنیاد اشتراکیت کے اصولوں پر رکھنا۔

چاہے سوشلزم اور کمیونزم اس کا صحیح جواب ہو یا نہ ہو لیکن یہ بات یقینی ہے کہ یہ جواب محض سیاسی زبان میں نہیں دیا جا سکتا بلکہ لازمی ہے کہ اقتصادی الفاظ میں دیا جائے۔ کیونکہ آج کل دنیا جس میں ہندوستان بھی شامل ہے اقتصادی بوجھ کے نیچے دبی ہوئی ہے اور اس سے کوئی مفر نہیں۔ سیاسی ڈھانچہ چاہے کوئی بھی ہو لیکن جب تک کہ مکمل اقتصادی آزادی ہم کو حاصل نہیں ہوتی ہم حقیقتاً آزاد نہیں ہو سکتے۔ اقتصادی آزادی میں ظاہر ہے کہ سیاسی آزادی شامل ہے۔ آج یہی ایک حقیقت ہے اور اس کے علاوہ باقی سب خواب اور حکایت اور ان میں سب سے بڑی جھوٹی حکایت فرقہ پرستی کی ہے۔

میں پھر پلٹ کر مجلس آئین ساز پر آتا ہوں۔ اگر کوئی ایسی جمہوری مجلس منتخب کی جائے جو حقیقتوں سے دوچار ہونے کی تاب لائے اور ان پر فیصلہ کر سکے تو یہ اقتصادی سوالات فوراً اس کو اپنی طرف متوجہ کر لیں گے۔ ان فرقہ وارانہ مطالبات کی طرف کوئی نظر بھی نہ اٹھائے گا کیونکہ عوام کو اپنا پیٹ بھرنے کی فکر اپنا حق فیصدی طلب کرنے کے مقابلہ میں زیادہ ہوگی ملک کی وہ طاقتیں جو کہ بالفعل ایک بیرونی حکومت یا ہندوستانی اہل غرض کے پاؤں کے نیچے دبی ہوئی ہیں پھر عود کر آئیں گی۔ عوام کی ضروریات ملک

کی رہنمائی کریں گی اور آزاد عوام حالانکہ وہ کبھی کبھی غلطی بھی کرتے ہیں لیکن ان کی نظریں ہمیشہ حقیقتوں پر رہتی ہیں اور وہ کسی خواب وخیال میں الجھ کر نہیں رہجاتیں ۔ مزدور اور کسان برسر اقتدار آجائیں گے اور انکے فیصلے چاہے وہ ناقص بھی ہوں ہمیں آزاد کرنے میں بہت کچھ مدد دیں گے ۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجلس آئین ساز کیا طے کرے گی ۔ لیکن مجھے عوام پر بھروسہ ہے اور میں ان کے فیصلے ماننے کو راضی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ فرقہ وارانہ مسئلہ جس وقت کہ عوام کی سچی رائے پر چھوڑ دیا جائے گا تو خود بخود غائب ہو جائے گا ۔ یہ تو محض ایک ایسا پودا ہے جو کانفرنس کے کمروں کی مصنوعی گرم فضا اور ماحول میں نشو و نما پا سکتا ہے لیکن اگر اسے کھلی ہوا یا دھوپ میں لے جایا جائے تو یہ فوراً مرجھا جائے گا ۔

رقمہ ناچیز علی حسین کاتب ۔ چکمنڈی ۔ لکھنؤ